ولی محمد چودھری
تپش

(افسانے)

مصنف:

ولی محمد چودھری

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

104/B ۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ۔۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : **تپش** (افسانے)

مصنف : ولی محمد چودھری

پتہ : محلّہ کٹکوئی، امروہہ-۲۴۴۲۲۱ (یو۔پی۔)

تعداد : ۴۰۰

ناشر : انیس امروہوی

○ **تخلیق کار پبلشرز**

104/B۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود التمش

کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

مطبع : مینک آفسیٹ پروسس، گرورام داس نگر ایکس ٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۹۲

ملنے کے پتے:

- اہلو والیہ بکڈ پو، ۴۵/۹۹۸۸۔ نیوروہتک روڈ، دہلی۔۱۱۰۰۰۵
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ (یو۔پی)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۶
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)
- موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

ISBN: 81-87231-65-3

2005

T.P.: 0133

TAPISH *(Short Stories)*

By Wali Mohammed Chaudhary

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B - YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092

Ph.:011-55295989, 22442572 E-mail:qissey@rediffmail.com

○

والدِ محترم

چودھری احمدالدین

اور

والدہ

کے نام

○○

فہرست

ماسٹر پورن سنگھ

موسم بہار کی وہ ایک خوش گوار شام تھی۔ بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑے چلے جا رہے تھے۔ پیڑوں میں نئی کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ سوکھے ہوئے پتوں سے وہ نجات حاصل کر چکے تھے۔ سہانی ہوا کے جھونکوں کی سرسراہٹ دل میں امنگیں پیدا کر رہی تھی۔

میں تھکا ہارا اپنے دفتر سے گھر پہنچا تو بیوی نے بڑی بے دلی سے مجھے خوش آمدید کہا اور بجھے بجھے لہجے میں کہنے لگی کہ منہ ہاتھ دھوکر کپڑے بدل لیں، میں آپ کے لئے چائے لے کر آتی ہوں، مجھے آپ سے ایک اہم موضوع پر بات کرنی ہے!
اہم موضوع سن کر میں چونک گیا کہ بیوی کس اہم موضوع پر بات کرے گی؟ پھر خیال آیا کہ آج کل وہ ٹی۔ وی کی خبریں سن رہی ہے اور اخبار بھی پابندی سے پڑھ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نئی سیاسی اور مذہبی صورت حال پر ہی بات کرے۔ یوں بھی اِن دنوں ملک کے بگڑے ہوئے حالات ہی اہم موضوع ہو سکتے ہیں، اس کے علاوہ تو کوئی اور موضوع اہم ہو ہی نہیں سکتا۔

چائے کا کپ اس نے میز پر رکھا تو میں اسے سوالیہ نگاہوں سے تکنے لگا۔

وہ کہنے لگی۔ ''آپ دنیا زمانے کی فکر میں تو گلے جا رہے ہیں، لیکن آپ کو اپنے بچے کی کوئی پرواہ نہیں، اس کے مستقبل کے لئے آپ ذرا بھی فکر مند نہیں ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اس بار پھر تھرڈ کلاس نمبروں سے پاس ہوا ہے۔''

''لیکن ابھی وہ تیسرے کلاس میں ہے بیگم! اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کے نمبر کیسے آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اتنے چھوٹے بچے پر پڑھائی کا زیادہ لوڈ اچھا نہیں ہوگا۔''

''غلط کہہ رہے ہیں آپ۔'' بیوی نے کچھ غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہی وقت ہے جب اس کی بنیاد مضبوط کی جائے تاکہ اس کا مستقبل درخشاں و تابناک ہو، وہ ایک شاندار انسان بنے، آپ کی طرح معمولی کلرک نہیں۔ لہٰذا اس کو پڑھانے کے لئے میں نے نقوی صاحب سے بات کرلی ہے۔ وہ بڑی خوشامد کے بعد ایک گھنٹہ دینے کے لئے رضامند ہوئے ہیں۔ بس تھوڑی دیر میں وہ آنے ہی والے ہوں گے۔ آپ ان سے بات کرلیں۔''

''نقوی صاحب جیسے مہنگے ٹیچر کی کیا ضرورت تھی۔ کسی اور سے بات کرلینی تھی۔ چھوٹی کلاس کے بچوں کو پڑھانا کوئی مشکل کام تو ہے نہیں۔''

''کمال ہے...... آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ چھوٹی کلاس کے بچوں کو صحیح ڈھنگ سے پڑھانا بہت مشکل ہوتا ہے، ہمارا بچہ اب نقوی صاحب ہی سے پڑھے گا۔''

میری بیوی نے پورے اعتماد اور فیصلہ کن انداز میں کہا اور باہر چلی گئی۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور باہر آسمان کی طرف دیکھنے لگا جہاں پنکھ پھیلائے اُڑتے ہوئے بے نیاز پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی لگ بھگ دوڑتی ہوئی گئی، جیسے وہ اس دستک کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہو۔

میں بھی دروازے کی طرف بڑھا۔

'آداب، آداب' کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا نقوی صاحب تشریف لارہے ہیں۔

رسمی تعارف اور چند رسمی سے جملوں کے بعد بیوی کچن میں چلی گئی اور ہم دونوں کچھ لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے۔

چند ساعتوں کے بعد نقوی صاحب گویا ہوئے۔

"دیکھئے جناب، ایسا ہے کہ میرے پاس وقت تو بالکل نہیں ہے، پھر بھی آپ کی بیگم صاحبہ میرے گھر گئی تھیں۔ وہ میری مسز کی سہیلی ہیں۔ انہوں نے بے حد اصرار کیا کہ میں آپ کے بچے کے لئے ایک گھنٹہ ضرور نکالوں تو میں 'نہ' نہیں کہہ سکا۔ لیکن میرے ٹیوشن پڑھانے کے کچھ اصول ہیں۔ میں ہرایرے غیرے کے بچے کو نہیں پڑھاتا ہوں، صرف ان لوگوں کے بچوں کو پڑھاتا ہوں جو خاندانی ہوں اور تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوں۔ میں ایک گھنٹے کے پانچ سو روپے لیتا ہوں۔ وقت کا پابند ہوں اور اصول پسند انسان ہوں۔ میرے آنے سے پہلے بچہ پڑھنے کے کمرے میں موجود ہو، اس کے پاس ربر، پینسل، کاپیاں، کتابیں، ساری چیزیں سلیقے سے موجود ہوں۔ بچے کے کپڑے صاف ستھرے ہوں اور گھر میں کسی طرح کا شور شرابہ نہ ہونا چاہئے۔ پیسے میں مہینے کی پہلی تاریخ کو لیتا ہوں اور گرمیوں کی چھٹیوں کے بھی پیسے لیتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ جون کی چھٹیوں کے پیسے والدین کاٹ لیں۔ بچہ پڑھے یا نہ پڑھے، میں سال کے بارہ مہینوں کے پیسے لیتا ہوں اور اپنے اصولوں کے لئے میں نہ تو کوئی سمجھوتہ کرتا ہوں اور نہ ہی کسی قسم کی رعایت برتتا ہوں۔ آپ کسی بات کا بُرا نہ مانئے گا۔ ہوسکتا ہے کہ میری کچھ باتیں سخت ہوں۔ شاید آپ کو ناگوار بھی لگیں، لیکن Term & Conditions پہلے ہی طے ہو جائیں تو پھر کسی قسم کا تناؤ نہیں رہتا ہے۔ تعلیم دراصل اتنی آسان شئے نہیں ہے جتنا کہ لوگوں نے اسے سمجھ رکھا ہے۔ جناب پھلدار پودے کو تناور درخت میں تبدیل کرنے کے لئے بڑی محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے، تب کہیں جا کر میٹھے پھل کھانے کو ملتے ہیں۔"

"جی ہاں، یقیناً......" میں نے صرف اتنا ہی کہا۔

اس کے بعد میری بیوی نے چائے کی ٹرے میز پر لا کر رکھ دی۔

اور میں نقوی صاحب کے سراپے کو غور سے دیکھنے لگا۔

ستواں لمبی ناک، پتلے ہونٹ، شاندار سوٹ، ٹائی، براؤن چمکتے ہوئے جوتے، نقوی صاحب کی نفاست پسند طبیعت کی بھرپور عکاسی کر رہے تھے۔ پتلی پتلی نازک انگلیوں میں دمکتے ہوئے نگوں کی انگوٹھیاں، بے حد خوبصورت اور نازک۔ نقوی صاحب پلیٹ میں سے بسکٹ بھی اس احتیاط سے اُٹھا رہے تھے کہ بجلی کے کھمبے پر چڑھا ہوا مزدور بجلی کے ننگے تاروں کو بھی اس احتیاط سے نہیں چھوتا۔

میں نقوی صاحب کے اعلیٰ ایٹی کیٹ کا قائل ہو چکا تھا۔

چائے ختم کرنے کے بعد نقوی صاحب نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ وہ پانچ سو روپے سے ایک پیسہ بھی کم نہیں لیں گے۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو ہی انہیں پیسے چاہئیں۔

میرے ذہن میں سو سو کے پانچ نوٹ اور مہینے کی پہلی تاریخ اٹک کر رہ گئی۔

پھر وہ جانے کے لئے کھڑے ہو گئے اور بولے۔

"آپ لوگ آپس میں مشورہ کر لیں، اگر آپ کی رائے بدلے تو مجھے اطلاع کر دیں۔"

"نہیں، نہیں، اس میں رائے بدلنے کی کون سی بات ہے، ہم تو آپ کے بے حد شکر گذار ہیں کہ آپ ہمارے بچے کو پڑھانے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی نگرانی میں ہمارے بچے کا مستقبل نہایت روشن ہوگا۔" میری بیوی نے جلدی جلدی کہا۔

"ٹھیک ہے، اب آپ ہمیں اجازت دیں اور کل شام سے آپ بچے کو تیار رکھیں۔"

"جی، بہت بہت شکریہ، آداب، آداب" کی آوازوں کے ساتھ نقوی صاحب چلے گئے۔ ان کے جوتوں کی کھٹ کھٹ کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

اور پھر اسی کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ، دور بہت دور ایک اور آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ کچی پکی سڑک پر دور گاؤں کے چھوٹے سے قصبے کے اسکول کو جاتے ہوئے ماسٹر پورن سنگھ کے جوتوں کی آواز۔

کڑاکے کی ٹھنڈ اور کہرے سے ڈھکی ہوئی سڑک پر، کرتا، پائجامہ اور ایک اونی واسکٹ پہنے، دبلے پتلے، سوکھے ہوئے جسم کے ماسٹر پورن سنگھ اتوار کی چھٹی گزار کر چھ میل کا پیدل سفر طے کرتے ہوئے اپنے اسکول کی طرف آرہے ہیں۔

دسمبر کے آخری ہفتہ میں ماسٹر پورن سنگھ نے ہماری کلاس میں اپنی قمچی لہراتے ہوئے سخت لہجے میں اعلان کیا کہ سب لڑکے اس اتوار کے بعد اپنے اپنے بستر ساتھ لے کر اسکول آئیں اور اپنے کھانے پینے کا سامان بھی ساتھ لائیں۔ بورڈ کا امتحان ہے، اب میں رات کے دس بجے تک تمہاری کلاس لوں گا اور جن لڑکوں کے پاس بچھانے کے لئے رُوئی کے گدّے نہ ہوں، وہ اپنے لئے پرال کا بوریا سی کر لائیں۔ کوئی بھی لڑکا کسی قسم کا بہانا نہ کرے اور جو بھی اپنا بستر لے کر نہیں آیا اس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں شہر جانا ہے امتحان دینے کے لئے، اور میں چاہتا ہوں کہ تم سب اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤ۔''

پھر ویسا ہی ہوا بھی، ہم سب لڑکے اپنے کھانے، اوڑھنے اور بچھانے کا سامان لے کر اپنے اسکول پہنچ گئے۔ دن بھر پڑھائی ہوتی، شام کو دو گھنٹے کی چھٹی ملتی۔ پھر اس کے بعد رات کے دس بجے تک ماسٹر پورن سنگھ اپنی قمچی ہوا میں لہراتے ہوئے ہمیں پڑھاتے رہتے۔

آہستہ آہستہ دن گذرنے لگے، اور پھر ایک دن ماسٹر پورن سنگھ ہمیں امتحان دلانے کے لئے شہر لے کر آگئے، جہاں ہم لوگ ایک شکستہ سی دھرم شالہ میں ٹھہر گئے۔

پورن سنگھ کا حکم تھا کہ صبح کو سب لڑکے سویرے ہی تیار ہو جائیں۔

○○

سورج ابھی پوری طرح نکلا بھی نہ تھا کہ ہم سب تیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اسکول کی طرح پہلے پرارتھنا ہوئی۔

پھر خاموشی چھا گئی......!

ہم لوگوں کے سامنے بے حد اُداس اور خاموش کھڑے ماسٹر پورن سنگھ کچھ دیر کے بعد آگے بڑھے اور بولے۔ ''میرے پیارے بچو! آج امتحان صرف تمہارا ہی نہیں ہمارا بھی ہے۔ ہم نے جو محنت تمہارے ساتھ کی ہے، جس لگن سے تم نے پڑھا ہے اور تمہارے والدین نے تمہارے لئے جو اپنی اِچھاؤں کا تیاگ کیا ہے، ان سب کا پھل تمہیں اوشیہ ملے گا۔ مجھے پورا بھروسہ ہے، وشواس ہے کہ تم ضرور پاس ہو جاؤ گے اور اچھے انسان بن کر اپنے دیش کا مان بڑھاؤ گے اور اپنے اسکول کا نام بھی روشن کرو گے اور ہمارے نام کو بھی بٹہ نہیں لگاؤ گے۔ میری دُعائیں، میرا آشیرواد تمہارے ساتھ ہے۔'' یہ کہتے کہتے پورن سنگھ کی آواز بھرّا گئی۔

ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، جن کو وہ پوری کوشش کے ساتھ چھپا رہے تھے، اور ان کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔

''اب ایک ایک کر کے تم میرے پاس آؤ، میں تم سب کے ماتھے پر تلک کروں گا اور تمہیں وداع کروں گا۔''

تھالی میں آرتی کا سامان سجائے ہوئے ماسٹر پورن سنگھ ہر لڑکے کی آرتی اُتارتے، اس کے ماتھے پر تلک کرتے اور اسے آگے بڑھا دیتے۔ ایسا کرتے وقت شدت جذبات سے ان کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ جاتے۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں پاتے تھے۔

جب ہم اپنے ایگزامس روم (Exams Room) میں پہنچے تو میں نے عبدالعزیز کو اس کا نام لے کر آواز دی۔ اس پر شہر کا ایک لڑکا حیران ہو کر عبدالعزیز سے پوچھنے لگا۔

''کیا تم مسلمان ہو؟''

عبدالعزیز نے جواب دیا۔ ''ہاں! میں مسلمان ہوں۔''

یہ جان کر وہ لڑکا حیران رہ گیا اور بولا۔ ''مسلمان ہو تو ماتھے پر تلک کیوں لگائے ہوئے ہو؟''

عبدالعزیز نے کہا۔ ''میاں! یہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یہ تلک نہیں

ہے، یہ تو استاد کا آشیرواد ہے اپنے شاگرد کے لئے۔''
یہ سن کر وہ لڑکا بھونچکا سا رہ گیا۔

OO

''نقوی صاحب کی بات آپ نے سن لی۔'' بیوی نے کچن سے باہر آتے ہوئے کہا تو میری سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

''ہاں، سن لی۔''

''اب آپ کو ہر مہینے پانچ سو روپے کا بندوبست کرنا ہے اپنے لئے نہیں اپنے بچے کے لئے، اولاد کے لئے آدمی کیا نہیں کرتا؟ آخر سب کچھ ہی تو بچوں کے لئے ہے۔ آپ کو بس اتنا یاد رکھنا ہے کہ تنخواہ کے علاوہ پانچ سو روپے ایکسٹرا، اور مہینے کی پہلی تاریخ......''

ہوائیں اچانک تیز ہو گئی ہیں۔ آوارہ جھونکوں میں اُڑتا ہوا پیپل کا سوکھا پتا میری گود میں آ گرا ہے۔ میرے کان سائیں سائیں کی آوازوں سے گونج رہے ہیں اور ان میں تنخواہ کے علاوہ سو سو کے پانچ نوٹ، مہینے کی پہلی تاریخ اور بچے کا درخشاں مستقبل اٹکا ہوا ہے۔

OO

دھند سے گھرا مکان

میں بہت دیر سے بس کی کیو میں کھڑا ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک اس میں چھپی ایک غزل پر میری نظر پڑی...... شاعر کا نام پڑھ کر میں چونک گیا۔ کیوں کہ جس شاعر کی یہ غزل تھی وہ میرا کالج کا بہت ذہین اور ہونہار ساتھی تھا اور میرا بہت اچھا دوست۔ میں نے اس کا پتہ اپنے ذہن میں محفوظ کیا اور شاندار غزل کہنے پر اسے مبارکباد دینے اس کے گھر کی طرف چل دیا۔

وہ دور دور تک پھیلی ہوئی سرکاری ملازمین کی کالونی تھی۔ میں نے اس کا پہلا بلاک پار کیا، دوسرا پار کیا پھر تیسرا اور چوتھا بلاک پار کرنے کے بعد میں نے ایک عمارت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ دوسری منزل پر اس کا فلیٹ تھا۔ مجھے تلاش کرنے میں کافی دشواری ہوئی۔ اس کی نیم پلیٹ غائب تھی لیکن دوسرے تمام مکانوں کے دروازوں پر نیم پلیٹ اور نمبر موجود تھے۔ اس کے مکان کا صرف نمبر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی، ایک نوجوان نے آکر دروازہ کھولا اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ نوجوان کے پیچھے پیچھے وہ خود بھی آ گیا تھا۔ میں نے تناؤ کی لکیریں اس کے چہرے پر صاف دیکھیں...... اس نے لمحہ بھر کو مجھے پہچاننے کی کوشش کی اور دروازہ کھول دیا۔

''اندر آؤ......'' بڑی سرد مہری اور گہری لاتعلقی کے ساتھ اس نے مجھے گھر میں آنے کی دعوت دی۔ مجھے بڑا عجیب سا لگا اور کچھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی...... وہ

میرے بچپن کا دوست تھا اور ہم مدتوں کے بعد مل رہے تھے۔ پھر بھی وہ میری آمد سے خوش نہ تھا بلکہ بیزاری کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے...... اس نے ایک گلاس پانی پیا اور دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''میں نے آپ کی غزل ایک پرچہ میں پڑھی تھی۔ غزل مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے سوچا آپ کو مبارکباد دے آؤں اور یوں بھی آپ کے ساتھ ماضی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔''

''یقیناً...... ہم لوگ ماضی بعید کے بہت اچھے دوست تھے......'' اس نے قدرے توقف کے بعد اور کچھ خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ وہ شاید اب بالکل نارمل ہو چکا تھا۔

''شاعری آپ اتنی اچھی کرتے ہیں، مجھے بالکل پہلی بار اس کا علم ہوا۔''

''عرصہ ہوا مجھے شاعری چھوڑے ہوئے۔ اب میں کبھی کوئی شعر نہیں کہوں گا۔''

''کیوں......؟'' میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ یہ کالونی جو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، سرکاری ملازمین کی کالونی ہے...... میں اس کالونی میں اکیلا ہوں اور کالونی ہی میں کیا، اپنے دفتر میں بھی اکیلا ہوں اور میں نہیں چاہتا کوئی مجھے شک کی نظر سے دیکھے...... اس لئے میں لوگوں سے کم سے کم تعلق رکھتا ہوں...... میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے ملنے کوئی آئے۔ خاص طور سے میں اپنے پڑوسی ملک کے لوگوں سے تو بالکل ملنا ہی نہیں چاہتا۔ میری شاعری کے حوالے سے اکثر پڑوسی ملک کے لوگ مجھے خط لکھتے ہیں، مجھ سے ملنا بھی چاہتے ہیں...... میں نہ تو ان کے کسی خط کا جواب دیتا ہوں اور نہ ہی ان سے ملتا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اِن دونوں ملکوں کی سرحدیں حساس رہتی ہیں اور ذرا سی بھی کوئی بات ہو تو ہم شکوک کے گھیرے میں آجاتے ہیں...... اور میں تو یوں بھی سرکاری ملازم ہوں۔ ذرا سی کسی بات پر انکوائری شروع ہو جائے تو کوئی پُرسان حال نہ ہوگا۔ نوکری بھی جائے اور گھر سے بھی بے گھر ہو جائیں۔

میری بہن پڑوسی ملک میں رہتی ہے۔ وہ اس بات پر سخت ناراض ہے کہ میں

اسے اپنے ملک آنے کی کبھی دعوت نہیں دیتا، نہ ہی اسے کوئی خط لکھتا ہوں۔ حالانکہ پُرانے شہر میں آپ دیکھیں، ہمارے یہاں سے سیکڑوں لوگ پڑوسی ملک میں جاتے ہیں اور سیکڑوں وہاں سے آتے ہیں۔ لیکن ان کالونیوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ ایک بار میری بہن پڑوسی ملک سے آئی اور یہاں پُرانے شہر میں ایک عزیز کے یہاں آکر ٹھہری۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں خاموشی سے جاکر اس سے مل آیا۔ میں جاکر اس سے مل تو آیا لیکن ایک مستقل عارضہ میں مبتلا ہوگیا۔ مجھے اب ایسا لگتا ہے کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ کوئی درندہ یا کوئی خوفناک شئے، جس کا جبڑا کھلا ہوا ہے۔ شاید اژدھے کی مانند، جو مجھے نگل لینا چاہتا ہے۔ آپ یقین کریں، مجھے اپنے دفتر آتے جاتے یوں لگتا ہے کہ ہر موڑ پر کوئی ہے، جس کا جبڑا کھلا ہوا ہے اور مجھے اپنے اندر کھینچ رہا ہے...... میرے سینے میں ہر وقت ایک چبھن سی رہتی ہے...... دل کے آس پاس ایک جلن ہے جس سے نجات نہیں ملتی۔ پھر ہمارے پڑوسی بھی عجیب لوگ ہیں۔ ہر وقت اس چکر میں لگے رہتے ہیں کہ میرے گھر کون آیا اور کون گیا...... اب آپ ہی بتائیں کہ شاعری سے کچھ ملنا ہے نہیں، پھر میں اس کے حوالے سے کیوں تکلیفیں اور پریشانیاں اٹھاؤں؟"

وہ اسی طرح کی شاید کچھ اور باتیں بھی بتا رہا تھا۔ لیکن اب میری توجہ اس کی بجائے اس کے نوجوان بیٹے کی طرف تھی، جو پاس ہی بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے کی لکیریں تنی ہوئی اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"میاں کیا بات ہے، آپ کیوں پریشان ہیں......؟"

اُس نے اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا...... "یہ دیکھیے، ملک میں کتنی جگہ فساد ہوا ہے اور کتنے بے گناہ لوگ مارے گئے ہیں۔"

اُس کی بیوی جو پاس ہی کھڑی ہوئی ہماری باتوں کو بہت دیر سے سن رہی تھی، کہنے لگی۔ "نیچے کے فلیٹ والے ہمارے راشن اور سبزی کے تھیلوں کو بھی اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم ان میں بم یا دوسری کوئی غیر قانونی چیز لے کر آرہے ہیں۔"

اُس نے ایک گلاس پانی پیا اور بیوی سے بولا۔ ''آہستہ بولو، دروازے اور کھڑکیاں بند کر دو۔''

میں جب اس کے گھر سے باہر نکلا تو چاروں طرف اندھیرے کی حکمرانی تھی اور رات مسلسل...... کچھ دور جا کر میں نے پلٹ کر اُس پوری کالونی کو دیکھا، دور دور تک پھیلی ہوئی کالونی میں مجھے اس کا گھر گہری دھند میں گھرا ہوا لگا...... میں نے محسوس کیا کہ اس مکان کے چاروں طرف بھی گہری گرد جمی ہوئی ہے اور اس کے مکین بھی اپنی سمتیں کھو چکے ہیں۔

میں یقینی اور غیر یقینی میں گھرا آگے بڑھتا رہا اور سوچتا رہا کہ پھولوں سے میرا اور اس مکان میں رہنے والوں کا کیا رشتہ ہے...... پرندوں سے میرا کیا رشتہ ہے۔ جن راستوں سے ہو کر خوشیاں، تحفظ، سکون، وقار اور عظمت سفر کرتے ہیں، وہ راستہ مجھ سے کتنی دور ہے، کبھی ملے گا بھی یا نہیں، اس مکان سے کتنا دور ہے...... اس کے نوجوان بیٹے سے وہ راہیں کتنی دور ہیں۔ ان کے ذہنوں پر چھائی ہوئی گرد کبھی چھٹ سکے گی یا نہیں۔ انہیں کابوس سے نجات مل سکے گی یا نہیں، وہ کسی سمت کے راہی بن سکیں گے یا نہیں......، میں ان ہی خیالات میں ڈوبتا اُبھرتا آگے بڑھتا رہا۔

پت جھڑ کا موسم ختم ہو چکا تھا، پیڑوں میں نئی کونپلیں اور پھول در آئے تھے...... یہ شاید موسم بہار کی صبح تھی۔ وہ صبحیں کہاں گئیں جب میں چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ اُٹھتا، جسم بالکل ہلکا پھلکا ہوتا، خلاؤں میں اُڑنے کو جی چاہتا۔ وہ صبحیں کہ کائنات کے ہر گوشے میں خوشیاں پھوٹتی محسوس ہوتیں...... اور اک کا پہلا دن ہی ایسا قیامت خیز نکلا کہ تمام صبحیں دھندلی اور ساری شامیں تاریک ہو گئیں...... کیا میں کبھی اس دھند لکے سے باہر نکل سکوں گا؟ سفر کی صعبتوں سے نجات مل سکے گی؟ روح پر چھائی کائی کبھی چھٹ سکے گی یا نہیں؟ وہ مدار جس میں میں برسوں سے چکر کاٹ رہا ہوں، کبھی ٹوٹ سکے گا یا نہیں، میں کسی سمت کا راہی بن سکوں گا یا نہیں...... اور اگر میں کبھی اس مدار سے باہر آ سکا جس میں مجھے دھکیل

دیا گیا ہے، اس دھند سے باہر نکل سکا، جو میرے چاروں طرف چھائی ہوئی ہے تو کیا ضروری ہے کہ میں انسان ہی کے خدوخال میں باہر آؤں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں سمندر کے کنارے پڑے ہوئے گھونگھے کی شکل میں باہر آؤں یا ہو سکتا ہے کہ کیکڑے کی شکل میں تبدیل ہو جاؤں، کچھوے یا جھینگر میں بھی تو بدل سکتا ہوں۔ اتفاق سے اگر انسان ہی کی شکل میں باہر نکلنے میں کامیاب ہوا تو کیا ضروری ہے کہ میری سوچ وفکر بھی قائم رہے...... میرے دماغ سے سوالیہ نشان شروع ہوتا ہے اور پورے وجود پر پھیلتا چلا جاتا ہے۔

اُفق سے اُفق تک پھیلے ہوئے قوس۔ کے رنگوں کو میری ماں مجھے انگلی پکڑ کر دکھایا کرتی تھی۔ مجھے تمام رنگوں کا علم تھا۔ میں کتنا خوش ہوتا تھا قوس قزح کو دیکھ کر...... پھر اچانک یہ کیا ہوا، میں ان رنگوں کی پہچان کھو بیٹھا، آسمان کے دھنک رنگوں کی لذت بھول گیا، شبنمی بارش میں جسم کے مساموں سے پھوٹتی خوشی کے احساس کو بھول گیا۔ اب تو اُفق سے اُفق تک گہرے دھنویں کی لکیریں نظر آتی ہیں۔ شبنمی بارش کے بجائے آسمان سے بھاری بوٹ، رائفلیں، تعصب، نفرت اور عدم تحفظ ٹپکتا محسوس ہوتا ہے۔

میں مسلسل سفر کر رہا ہوں، اپنے مرکز کی تلاش میں ہوں، سمت کی تلاش میں سرگرداں ہوں، دھند سے گھرا دھند سے نکلنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہوں۔ میرا تیز گام سفر جاری ہے، صبح کی تلاش جاری ہے...... لیکن ابھی تک میری تمام کوششیں لاحاصل رہی ہیں...... کہ روشنی کسی کابوس کی مانند میرے اندر طلوع ہوئی، اندھیرا چاروں طرف حکمراں ہے اور رات مسلسل......

کئی پت جھڑ اور کئی موسم بہار گذرنے کے بعد کہرے سے ڈھکی ایک صبح میں پھر اس کالونی میں جا پہنچا...... اُس سرکاری ملازم کے مکان پر دستک دی۔ دروازے کے سراخ سے کسی نے دیکھا اور دروازہ کھول دیا...... سامنے اس کی دبلی پتلی بیوی کھڑی تھی۔

''میں آپ کے شوہر سے ملنے آیا تھا۔''

''وہ تو ہسپتال میں ہیں...... اندر تشریف لے آئیں......''

''کیا ہوا اُن کو...... سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''اُن کو دل کا دورہ پڑا تھا، اب قدرے بہتر ہیں۔''

''پہلی بار دل کا دورہ پڑا تھا یا اس سے پہلے بھی......''

''بالکل پہلی بار......''

''کوئی خاص بات تھی یا......''

''ہوا یہ تھا کہ......'' اس نے اپنی سانسوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔'' آپ شاید جانتے ہیں کہ ہم لوگ یہاں کس خوف زدہ ماحول میں سانسیں لے رہے ہیں، اور کتنے سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ میرے شوہر کچھ زیادہ ہی خوف زدہ رہتے ہیں۔ وہ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں، پڑوسی ملک کے لوگوں سے تو ملتے ہی نہیں...... اب اس دن ہمارے گھر پڑوسی ملک کے ایک صاحب تشریف لے آئے۔ گھر آئے ہوئے مہمان کو نکالا بھی نہیں جاتا۔ وہ صاحب دو دن ہمارے گھر ٹھہرے۔ ہم لوگ ان کے ساتھ باہر تک نہیں نکلے، چُپ چاپ گھر میں پڑے رہے۔ میرے شوہر دفتر جاتے وقت مجھ سے کہہ گئے کہ یہ صاحب اگر جانا چاہیں تو ان کو تکلفاً بھی مت روکنا...... اگلے دن وہ خود ہی چلے گئے اور ہم نے چین کی سانس لی...... سب کچھ معمول پر آ گیا......''

وہ کچھ لمحوں کے لئے رکی، ایک دو لمبی سانسیں لیں اور بولی۔'' اچانک پندرہ بیس دِن کے بعد شام کو دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم نے دروازہ کھول کر دیکھا، سامنے پولیس کا آدمی کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہم سب کا خون سوکھ گیا، ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے...... پھر بھی کسی طرح ہم نے اپنی اکھڑی سانسوں اور خوف پر قابو پایا ...... پولیس والے کو اندر آنے کی دعوت دی۔ وہ اندر آ کر بیٹھ گیا۔ میرے شوہر اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ پولیس والے نے ان سے کہا......

"میں آپ کے دفتر بھی گیا تھا، لیکن آپ وہاں سے آ چکے تھے۔" وہ خاموش رہے۔ پولیس والا پھر بولا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پڑوسی ملک میں آپ کے کون کون رشتہ دار رہتے ہیں......؟"

"پڑوسی ملک میں میرا کوئی رشتہ دار نہیں رہتا۔" میرے شوہر نے صاف جھوٹ بولا۔

"پچھلے دنوں آپ کے یہاں باہر سے کوئی آیا تھا؟"

"نہیں......کوئی نہیں آیا......" انہوں نے پھر جھوٹ بولا۔ اس بیچ میں میں پولیس والے کے لئے چائے اور بسکٹ لے آئی۔ اُس نے شکریہ کے ساتھ چائے لے لی۔ پھر وہ اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو پڑوسی ملک میں آپ کا کوئی رشتہ دار نہیں رہتا اور پچھلے دنوں آپ کے گھر وہاں سے کوئی آیا بھی نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ آپ خیال رکھیں، میں پھر آؤں گا۔" وہ یہ کہہ کر کہ "میں پھر آؤں گا" بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ باہر چلا گیا، اسی وقت سے میرے شوہر کی چھاتی میں درد شروع ہو گیا...... کچھ دیر کے بعد ان کو دل کا دورہ پڑا، میں پریشان ہو اُٹھی، فوراً ہی بچوں کی مدد سے انہیں اسپتال لے گئی......اب وہ پہلے سے بہتر ہیں۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔"

میں جب اس مکان سے باہر نکلا تو چاروں طرف کہرا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں بیبے کالونی کے خوبصورت درختوں کی پتیوں کے اوپر سے پھسلتی ہوئی آواز آرہی تھی...... "ایشور اللہ تیرو نام، سب کو سمتی دے بھگوان۔"

تیز سرد ہوا کا جھونکا آیا اور میرے پورے وجود کو بیچ میں سے چیرتا ہوا گزر گیا کہ روشنی ایک کابوس کی مانند میرے اندر طلوع ہوئی، اندھیرا چاروں طرف حکمراں تھا اور رات مسلسل......

OO

چھلانگ

ہوٹل واپس آتے آتے مجھے رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ صرف ایک رات میرے پاس تھی۔ صبح سویرے ہی مجھے گوا کے لئے نکل جانا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے روم سروس کے نمبر ڈائل کیے۔ اُدھر سے جواب آنے پر دو سوڈے کی بوتلیں، ایک پلیٹ سلاد اور برف کا آرڈر دے کر میں نے کپڑے بدلے اور باتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر شاور کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھا رہا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کی دھول جسم سے صاف ہوئی، دماغ سے ڈیزل اور پٹرول کی بدبو غائب ہوئی تو خیال آیا کہ...... وقت کم ہے...... صرف ایک رات اپنے پاس ہے۔ صبح سویرے ہی گوا کے لئے روانہ ہونا ہے۔ یہ سوچ کر میں جلدی سے باتھ روم سے باہر آیا۔ پونے نو بج چکے تھے۔ جلدی جلدی تولیہ سے جسم صاف کیا، سر کے بالوں کو خشک کرتے ہوئے ایک گلاس اُٹھایا، ریڈ نائٹ کی بوتل اُٹھائی، تھوڑی سی وہسکی گلاس میں ڈالی۔ گو کہ بیرا ابھی تک برف اور سوڈا لے کر نہیں آیا تھا، سوچا پہلا پیگ سادے پانی ہی سے لے لوں کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''اندر آجاؤ۔'' میں نے کہا۔

بیرا سوڈے، سلاد کی پلیٹ اور برف کی بالٹی ایک ٹرے میں اُٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا۔ میں نے اپنے گلاس میں برف کے تین کیوب ڈالے۔ سوڈے کی بوتل بیرے نے کھولی، میرے گلاس میں سوڈا ڈالا اور کہنے لگا۔

''سر...... کچھ اور چاہئے۔''

''نہیں......''

بیرا چپ چاپ باہر چلا گیا۔ میں نے اپنا گلاس اُٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں آدھا کر دیا۔ کھیرے کے دو ٹکڑے منہ میں ڈالے اور دوسرے گھونٹ میں پورا گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ گھڑی دیکھی، نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ پینٹ، بش شرٹ اور جوتے پہن کر میں نے چہرے پر کریم لگائی۔ سینٹ اسپرے کر کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بالوں میں کنگھا کرنے لگا۔ اس سے فارغ ہو کر دوسرا پیگ بنایا۔ برف اور سوڈا مکس کر کے آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا اور ہلکے ہلکے وہسکی کی چسکیاں لینے لگا۔

تیسرا پیگ بنانے کے بعد میں نے شام کے اخبار کی سرخیوں کو بے دلی سے دیکھا۔ اس کے بعد منٹو کی کہانیوں کے مجموعے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا جسے میں نے ایک بک اسٹال سے خریدا تھا۔ کتاب کو یہاں وہاں سے دیکھ کر ٹیبل پر رکھ دیا۔ گھڑی دیکھی، دس بجنے والے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ تیسرا پیگ میں نے خالی کیا اور کھڑا ہو گیا۔ آئینے میں ایک بار پھر اپنے سراپے کو غور سے دیکھا۔ بالوں کو ٹھیک کیا۔ کمرے کی لائٹ آف کی، تالا لگایا اور لفٹ کے ذریعہ نیچے آ گیا۔ ریسپشن پر اپنے روم کی چابی رکھی اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ ہوٹل کے باہر کھڑی ٹیکسیوں میں سے ایک صاف ستھری ٹیکسی کا انتخاب کیا اور اس کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیور نے مجھے آتا دیکھ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا، ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کیا، میں نے اسے ایک ڈین کا نام بتایا کہ وہاں جانا ہے۔ ڈرائیور نے 'ہاں' میں سر ہلایا اور چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد اس نے ایک عمارت کے سامنے گاڑی روکی اور اشارے سے کہا کہ وہ رہا...... سامنے...... میں ٹیکسی سے نیچے اُترا، پیسے دئے اور ڈین کی ٹکٹ ونڈو کی طرف بڑھ گیا۔ ٹکٹ لے کر میں ڈین کے داخلی دروازے پر پہنچا جہاں انتہائی

خونخوار شکل کے لمبے تڑنگے دو آدمی کھڑے تھے۔ میں نے ایک کے ہاتھ میں ٹکٹ دیا۔ اس نے آدھا ٹکٹ پھاڑ کر مجھے واپس کر دیا اور راستے میں اڑی ہوئی اپنی ٹانگ ایک طرف ہٹا کر اندر جانے کا راستہ دے دیا۔

رات کے پَر ابھی پوری طرح نہیں پھیلے تھے۔ اسی لئے ڈین بھی ابھی پورے شباب پر نہ تھا۔ لڑکیاں ہال کی دیوار کے ساتھ ساتھ تقریباً قطار بنائے خاص زاویہ سے مسکراتی ہوئی کھڑی تھیں...... ہال میں تیز میوزک اور رنگ برنگی روشنیوں کے بڑے بڑے لیمپ گھوم رہے تھے۔ صاف شکل تو کسی کی بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ وسط ہال میں ایک شخص نشے میں چور دو لڑکیوں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ ہر طرف سے خوشبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ جو لوگ اپنے لئے لڑکیوں کا انتخاب کر چکے تھے، وہ ہال کے دوسری طرف ٹین شیڈ میں بیٹھے، جو کہ سمندر کی جانب تھا، وہسکی یا بیئر پی رہے تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ہال میں ابھی اتنی جگہ تھی کہ آدمی با آسانی اِدھر سے اُدھر گھوم سکتا تھا اور بہت سی خوبصورت لڑکیوں اور عورتوں میں سے اپنی پسند کی عورت یا لڑکی کا انتخاب کر سکتا تھا۔

میں ہر لڑکی پر بھرپور نظر ڈالتا ہوا نظروں ہی نظروں میں اس کے سراپے کو تولتا ہوا آگے بڑھنے لگا کہ جلد سے جلد اپنے لئے کسی لڑکی کا انتخاب کروں اور اسے ساتھ لے کر ہوٹل واپس جاؤں۔ لیکن روشنیوں کا کچھ اس طرح بندوبست کیا گیا تھا کہ ایک بھی چہرہ اور ایک بھی بدن پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹہلتا ٹہلتا میں ہال کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا۔ ہال کے کونے میں تین لڑکیاں آگے پیچھے قطار میں کھڑی تھیں۔ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ سامنے کی طرف خاص پوز بنائے دیکھ رہی تھیں۔ پہلی، دوسری، تیسری۔ تیسری لڑکی پر میری نظر پڑی تو میں رُک گیا، اور اس لڑکی کے بالکل پاس آ گیا۔ میں نے کسی قصائی کی مانند جو جانتا ہو کہ سودے میں کہاں کتنا گوشت، کتنی ڈکری، کتنی چربی ہے، اس لڑکی کو تولا...... رنگ برنگی روشنیوں کے درمیان وہ نگینے کی مانند دمک رہی تھی۔ ہلکی پھلکی روشنی جب اس کے

رخساروں پر پڑی تو لگا کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ چہرہ پہلی ہی نظر میں اس قدر جانا پہچانا لگا کہ دماغ جھٹکا کھا گیا اور نشہ ایک دم سے کئی ڈگری نیچے آ گیا۔ میں نے اپنا چہرہ بالکل اس کے سامنے کر دیا، بلکہ بے جا قریب کر دیا کہ شاید وہ بھی مجھے پہچانتی ہو اور اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی آئے۔ لیکن اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ وہ اپنے خاص انداز میں سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ کون لڑکی ہے؟ اُس کو کہاں دیکھا ہے؟ لڑکی کے تعلق سے میری سوچ گہری ہو گئی اور اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی لمحوں میں میرا نشہ کافی اُتر گیا اور اس ڈین کا ماحول مجھے انتہائی گھناؤنا لگنے لگا۔ مجھے لگا کہ یہ خوبصورت دوشیزاؤں سے بھرا ڈین نہ ہو بلکہ گائے، بھینس، بکریوں کی پینٹھ ہو جہاں خریدار اپنے پسندیدہ جانور کی تلاش میں ٹہل رہا ہو۔

میں تیزی سے اس لڑکی کے پاس سے ہٹا اور ہال سے نکل کر باہر ٹین شیڈ میں آ گیا، جہاں سمندر کی طرف سے آنے والے ہوا کے تازے جھونکے جسم سے ٹکرائے تو کچھ توانائی کا احساس ہوا۔ شیڈ میں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ لڑکے اپنی پسندیدہ لڑکیوں سے معاملات طے کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے ایک کرسی اپنی طرف کھینچی اور بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک لمبے لمبے سانس لئے اور بیرے کو آواز دے کر پاس بُلایا۔ ایک سو کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا اور اس سے کہا۔

''وہسکی کا ایک لونگ پیگ فوراً لے کر آؤ۔''

بیرا تیزی سے ایک پیگ لے آیا۔ میں نے دو تین گھونٹوں میں ہی اسے خالی کر کے ایک چھوٹا پیگ اور لانے کو کہا۔

بیرا وہسکی کا ایک اِسمال پیگ لایا اور ساتھ میں ڈیڑھ سو روپے کا بل بھی۔ میں نے بل ادا کیا اور آرام سے وہسکی سِپ کرنے لگا۔ پھر خیال آیا کہ اگر اس لڑکی کے ساتھ رات گزارنی ہے تو فوراً اس سے رابطہ قائم کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اور اسے لے جائے اور تم کفِ افسوس ملتے رہ جاؤ۔

میں نے جلدی سے اپنا پیگ خالی کیا اور تیزی سے پھر ہال میں داخل ہو گیا۔

اب ہال میں پہلے سے زیادہ بھیڑ ہو گئی تھی۔ پھر بھی مجھے دوسرے سرے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ وہ لڑکی اپنی جگہ کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ میں اس کے قریب پہنچا اور بولا۔

"میڈم، آپ مجھے پسند ہیں۔ کیا آپ میرے ساتھ باہر ٹین شیڈ تک آئیں گی؟"

لڑکی مقناطیسی انداز میں اپنی جگہ سے ہٹی اور میرے پیچھے پیچھے ہو لی۔ ہم دونوں ہال سے نکل کر ٹین شیڈ میں آئے تو ایک بار پھر سمندر کی طرف سے آنے والی بھیگی بھیگی ہواؤں نے ہم دونوں کو خوش آمدید کہا اور سانس لینے میں کچھ آسانی ہوئی تو میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ لیکن یہاں بھی روشنی ناکافی تھی۔ لڑکی کے نقوش واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر بھی میرا ذہن مسلسل اس سوچ میں تھا کہ اس کو کہاں دیکھا ہے۔

"آج کی رات میرے ساتھ گزارنے کی آپ کیا قیمت لیں گی؟ میرا مطلب ہے کہ کتنے پیسے لیں گی۔"

"دو ہزار۔"

لڑکی نے انتہائی مختصر جواب دیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

"دو ہزار تو آپ بہت مانگ رہی ہیں۔ میں ایک ہزار دے سکتا ہوں۔"

"میں دو ہزار ہی لوں گی۔"

"کمال ہے میڈم۔ ایسا ہوتا ہے کیا کہ آدمی جو مانگے وہ اس کو مل جائے۔"

"میں دو ہزار ہی لوں گی کیوں کہ میں نہ تو دو ہزار سے زیادہ کسی سے مانگتی ہوں اور نہ ہی دو ہزار سے کم پر کسی کے ساتھ جاتی ہوں۔"

لڑکی نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں قطعیت کے ساتھ کہا تو میں ٹپٹا گیا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میڈم، میں آپ کو پندرہ سو دے سکتا ہوں۔"

''نہیں، میں دو ہزار ہی لوں گی۔ آپ اپنا اور میرا دونوں کا وقت برباد کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ جانے لگی تو میں نے دو ہزار روپے دینا منظور کر لئے۔ لیکن میرے منہ کا ذائقہ بگڑ گیا کہ یہ لڑکی بڑی ظالم ہے۔ ہر بات پر نہ ہی نہ کہتی ہے اور چہرے کی مسکراہٹ پھر بھی غائب نہیں ہوتی۔ میں نے بھی اپنے آپ کو جھٹک دیا کہ جہاں پندرہ سو وہاں دو ہزار۔ پانچ سو کے لئے کیا موڈ خراب کرنا۔

''آیئے چلیں!'' میں نے اس سے کہا تو اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''پہلے پیسے لایئے۔'' میں نے پانچ سو کے چار نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھا دئے۔ اس نے بے فکری سے اپنے بیگ میں ڈالے اور میرے ساتھ ڈین سے باہر آ گئی۔ باہر آ کر ہم دونوں ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کو میں نے ہوٹل کا نام بتایا۔ اس نے میٹر ڈاؤن کیا اور چپ چاپ ہوٹل کی طرف چل دیا۔ لڑکی میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ لیکن یہاں بھی روشنی کم ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔ ایک کانٹے کی طرح وہ میرے دماغ میں چبھی ہوئی تھی کہ یہ کون ہے؟ سوچتے سوچتے جب مجھے الجھن ہونے لگی تو میں نے یوں سوچنا شروع کیا کہ کیا اس کی صورت میرے کسی شناسا سے ملتی جلتی ہے؟ سوچتے سوچتے ہوٹل آ گیا لیکن میری الجھن دور نہ ہوئی۔

میں نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور ہم دونوں ہوٹل کی طرف بڑھے۔ ہمیں آتا دیکھ کر گیٹ کیپر نے بڑی محبت سے گیٹ کھولا، Reception سے میرے کمرے کی چابی لی اور ''آیئے صاحب'' کہتا ہوا لفٹ کی طرف دوڑا۔ لفٹ کا دروازہ کھول کر ہم دونوں کے اندر داخل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے لفٹ کا دروازہ بند کیا اور میرے فلور کا بٹن دبا دیا۔ فلور آنے پر وہ تیزی سے میرے روم کی طرف گیا۔ دروازہ کھولا اور سلام کے لئے ہاتھ اُٹھا دیا۔ میں نے پچاس کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ خوشی سے اس نے ہم دونوں کو ''گڈ نائٹ'' کہا اور چلا گیا۔

روم کے اندر داخل ہو کر میں نے ایک لمبی گہری سانس لی کہ چلو لڑکی لانے اور اس کے ساتھ رات گزارنے کا تناؤ تو ختم ہوا کہ کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ہوٹل کا بیرا کھڑا تھا۔ ''آؤ، اندر آؤ۔''

''سر...... ایسا ہے روم سروس ۱۲ ر بجے بند ہو جاتی ہے۔ آپ کو اگر کھانے کا آرڈر دینا ہے تو ابھی دے دیجئے۔ آرڈر سپلائی کرنے میں بھی ہمیں ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، ابھی آرڈر دے دیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے معلوم کیا۔ ''آپ کیا لیں گی؟''

''جو آپ کو پسند ہو، منگا لیں۔''

''کوئی خاص ڈش اگر آپ پسند کریں تو۔''

''نہیں کوئی خاص نہیں۔ آپ اپنی پسند سے منگا لیں۔''

''Vegetarian یا Non-Vegetarian''

''میں سب کچھ کھا لیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ کیا آپ وہسکی لیتی ہیں؟''

''نہیں!''

''ہماری کمپنی کی خاطر تھوڑی سی۔''

''میں بالکل نہیں پیتی۔ مجھے Thums Up منگا دیں۔''

میں نے بیرے کو کھانے کا آرڈر دیا اور اس سے کہا کہ وہ فوراً Thums up، دو سوڈے اور برف لے آئے۔

''رائٹ سر۔'' بیرے نے کہا اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''سر...... اگر آپ بُرا نہ مانیں تو آپ کی وہسکی میں سے ایک کواٹر میں بھی لے لوں۔'' میں نے ریڈ نائٹ کی بوتل کی طرف دیکھا، وہسکی کافی تھی۔ میں نے بیرے سے کہا کہ وہ وہسکی لے لے۔ بیرا جلدی سے کواٹر لایا اور اسے بھر لیا۔ اس

کے بعد وہ بولا۔ ''سر اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں ایک چکن بریانی آپ کے اکاؤنٹ میں کھالوں؟'' میں نے انتہائی ناگواری سے کہا۔ ''ہاں، چکن بریانی بھی کھا۔لیکن تھمس اپ، سوڈے اور برف جلدی سے دے جا۔''

''ابھی لایا سر۔''

یہ کہہ کر بیرا چلا گیا۔ میں نے ایئر کنڈیشن کی کولنگ اور بڑھائی اور باتھ روم میں چلا گیا۔ کپڑے بدل کر لنگی باندھی اور باہر آگیا۔ ریڈ نائٹ کی بوتل اور گلاس لے کر میں آلتی پالتی مار کے فرش پر بیٹھ گیا۔ لڑکی سے کہا۔ ''آیئے، فرش پر بیٹھتے ہیں۔''

فرش پر شاندار قالین بچھا تھا۔ لڑکی جواب تک صوفے پر بیٹھی تھی، کسی کٹھ پتلی کی مانند صوفے سے اُٹھی اور کارپیٹ پر میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اب میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ، اس کا جسم سب کچھ میری نظروں کے سامنے بالکل صاف تھا کہ ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''اندر آجاؤ۔'' بیرا برف، سوڈے اور تھمس اَپ لئے اندر آیا...... ہم دونوں کے بیچ میں اس نے ٹرے رکھ کر میرا پیگ بنایا، برف کے ٹکڑے ڈالے اور سوڈے کی بوتل کھول کر سوڈا ڈالا۔ تھمس اَپ کا کارک کھول کر لڑکی کو تھمایا اور بولا۔ ''صاحب! اب ایک گھنٹے کے بعد میں آپ کا کھانا لے کر آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

میں نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہسکی کا گلاس اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے میں نے لڑکی سے کہا۔ ''کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟''

''آشا۔''

''آشا یا عائشہ......؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کے ساتھ ہی ایک لمبا گھونٹ میں نے وہسکی کا لیا اور لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ''میرا نام تو آشا ہی ہے۔ آپ اپنی سہولت کے لئے چاہے جو نام دے لیں۔''

''نہیں آپ آشا نہیں عائشہ ہی ہیں۔'' میں نے قطعیت کے ساتھ کہا اور اپنا

گلاس خالی کر دیا۔ جلدی سے اگلا پیگ بنایا، برف ڈالا، سوڈا ڈالا اور سوڈے کے جھاگوں میں ڈولتے ہوئے میں نے اپنی آنکھیں لڑکی کے چہرے پر گاڑ دیں جو کہ عائشہ ہو کر بھی اپنے آپ کو آشا بتا رہی تھی۔ میں اس کی بے جان آنکھوں میں تیرتا ہوا اپنے چھوٹے سے شہر پہنچ گیا۔ میرے گھر کے پاس ہی غضنفر شاہ کا مکان تھا جہاں میں بچپن ہی سے بے روک ٹوک آیا جایا کرتا تھا۔ غضنفر شاہ خاں میونسپلٹی میں چپراسی تھے۔ ایک بار میونسپلٹی کے کسی کام سے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ وہاں پر اچانک ہندو مسلم فساد ہو گیا اور غضنفر شاہ خاں کسی فسادی کی گولی کا شکار ہو گئے۔

ان کی بیوہ سعیدہ بیگم تقسیم ہند میں تتر بتر ہوئے ایک پٹھان خاندان کی، انتہائی خوبصورت اور خواہشوں کی غلام عورت تھیں۔ ان کے لئے ایک چپراسی کی بیوی ہونا ہتک آمیز تھا۔ لہٰذا غضنفر شاہ خاں کی موت کا انہیں کوئی دکھ نہ ہوا۔ رسماً رو دھو کر وہ خاموش ہو گئیں اور اپنی باقی ماندہ زندگی کو ڈھنگ سے گزارنے اور سماج میں پُر وقار مقام حاصل کرنے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگیں کہ ایک دن اچانک انہیں اپنی نوشابہ خالہ یاد آ گئیں...... خالہ یاد آتے ہی سعیدہ بیگم نے اپنی بیٹی عائشہ کو غور سے دیکھا جو کہ اپنی چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کے ساتھ صحن میں کھڑے نیم کے پیڑ میں جھولا ڈالے سولہویں ساون کی پھواروں کا آنند لے رہی تھی۔

سعیدہ بیگم کی آئیڈیل نوشابہ خالہ گرگِ باراں دیدہ عورت تھیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا، انتہائی کھائی کھیلیں تھیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے لئے ایک کروڑ پتی کے بیٹے کو کچھ اس طرح جال میں پھانسا تھا کہ پی۔ سی۔ سرکار کی جادوگری بھی فیل کر دی تھی۔ یوں اپنی بیٹی کی سیڑھی پر چڑھ کر نوشابہ خالہ سماج کی باعزت عورت بن گئی تھیں۔ ان کی بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ چمچماتی ہوئی کار میں بیٹھ کر ان سے ملنے آتی تو پورا محلہ عش عش کرتا۔ نوشابہ خالہ کی اینٹھ ہی نرالی تھی۔ گھر میں سہولت کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ شادی بیاہ میں وہ بڑے ٹھسے سے جاتیں۔ خوش آمدیوں کی ان کے چاروں طرف [illegible] ٹھٹ تھے ان کے......

سعیدہ بیگم کا آئیڈیل نوشابہ خالہ تھیں اور سیڑھی عائشہ جو کہ سولہویں ساون کے جھولے میں بیٹھی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ سعیدہ بیگم نے بھی اس کے ساتھ پینگیں بڑھائیں اور دل ہی دل میں خوش ہو گئیں۔

عائشہ کے لئے انہوں نے تین چار جوڑی نئے کپڑے سلوائے۔ نئے اسٹائل کے سینڈل خریدے۔ اس کے بعد اپنی سسرال والوں سے زوردار جنگ لڑی اور گھر میں ان کا آنا جانا بند کر دیا۔ خود اپنے ملنے والوں کی تعداد بھی مختصر کر دی اور ان لوگوں کے لئے بھی دروازے بند کر دئے جو اُن پر نکتہ چینی کریں۔ ان سب سے نپٹ کر انہوں نے اپنی توجہ شہر کے ایک امیر باپ کے بیٹے شکیل پر مرکوز کر دی...... اور اسے اپنے گھر بُلانے کی تمام راہیں ہموار کر دیں۔ شکیل جب سعیدہ بیگم کے گھر آیا تو انہوں نے بڑے پیار، محبت اور شفقت سے اس کا استقبال کیا، اور آہستہ سے اس کا تعارف عائشہ سے کرایا۔

شکیل اب عائشہ سے ملنے اکثر شام کو آیا کرتا۔ اِس وقت گھر پر کسی نہ کسی کے آنے کا خطرہ رہتا اور سعیدہ بیگم کی بے چین نظریں دروازے اور عائشہ کی کوٹھری کا طواف کرتی رہتیں...... لہٰذا ایک دن سعیدہ بیگم نے شکیل سے کہا۔

"شکیل میاں! کبھی دوپہر کو بھی آجایا کرو...... میں اور عائشہ دونوں ہی آپ کو یاد کرتے ہیں۔ میں تو پھر بھی گھر کا کچھ کام دھام کرتی رہتی ہوں لیکن عائشہ تو بالکل ہی خالی رہتی ہے۔"

شکیل بھی اسی سوچ میں تھا کہ کوئی ایسا ہی وقت ہونا چاہئے جب گھر میں آنے جانے والوں کا خطرہ کم سے کم ہو اور وہ کھل کر عائشہ سے باتیں کر سکے۔

سعیدہ بیگم کا اشارہ ملتے ہی شکیل نے دوپہر کو آنا جانا شروع کر دیا۔ شکیل کے آتے ہی سعیدہ بیگم اسے لے کر کمرے میں چلی جاتیں۔ کچھ دیر یوں ہی رسمی سی بات چیت کرتیں پھر عائشہ کو آواز دیتیں۔

"بیٹے دیکھو...... شکیل میاں آئے ہیں۔" عائشہ ادب سے شکیل کو سلام کرتی

اور مسکراتی ہوئی، سمٹی سمٹی اور شرماتی ہوئی چارپائی کی پٹی پر ٹک جاتی۔ سعیدہ بیگم یہ کہہ کر اُٹھ جاتیں...... ''لو بھئی، آپ لوگ باتیں کرو، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

شکیل اور عائشہ کوٹھری میں بیٹھے گھنٹوں پیار بھری باتوں میں مصروف رہتے اور بے خبر رہتے کہ اس مکان میں ایک تنگ و تاریک کوٹھری اور بھی ہے جس میں سعیدہ بیگم کے بچے بیٹھے بیڑیاں بنا رہے ہیں۔ دونوں کو سعیدہ بیگم کی سخت ہدایت تھی کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ اس کوٹھری میں کیا ہو رہا ہے، اور خاص طور سے اس وقت جب شکیل بھائی موجود ہوں تو کوئی کھانسے بھی نہیں، چاہے اس کا دم ہی کیوں نہ نکل جائے۔

عائشہ بے حد شرمیلی، سیدھی سادی لڑکی تھی۔ شکیل سے بے تکلف ہونے میں اسے بہت وقت لگ گیا۔ جب بھی کبھی شکیل اس کا ہاتھ پکڑتا وہ شرم سے گلنار ہو جاتی۔ شکیل نے اس سے شادی کا پکا وعدہ کر لیا۔ ساری دنیا کو چھوڑ کر صرف اس کا ہونے کی قسم کھالی...... اس کے بعد وہ پابندی سے عائشہ سے ملنے آنے لگا۔ سعیدہ بیگم کے منع کرنے کے باوجود وہ کوئی نہ کوئی تحفہ عائشہ کے لئے ضرور لاتا۔ جسے عائشہ دیر تک غور سے دیکھا کرتی۔

یوں تو سب کچھ سعیدہ بیگم کی مرضی کے مطابق چل رہا تھا۔ لیکن رات جب گہری ہو جاتی، سارا قصبہ جب نیند کی آغوش میں پناہ گزیں ہوتا تو سعیدہ بیگم گھر کے دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کرتیں۔ صحن میں چارپائیوں پر سو رہے اپنے تینوں بچوں پر نظر ڈالتیں اور گھر کے کسی کونے میں چھپا کر رکھا ہوا بیڑیوں کا بھیگا ہوا پتہ اُٹھا کر لاتیں اور اپنی چارپائی پر رکھ کر قینچی اور پتہ کاٹنے کا فرما اُٹھاتیں اور پتہ کاٹنا شروع کر دیتیں۔ تب انہیں اپنے مرحوم شوہر غضنفر شاہ خاں کی شدید یاد آتی اور ان کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتیں۔ وہ حسرت و یاس، ناداری اور محرومی کا پیکر بنی انتہائی درد بھرا گیت گنگنانا شروع کر دیتیں اور دیر تک ان کی حالت ایسی ہی رہتی۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتیں اور ان کی نظر عائشہ کے

تیکھے نقوش پر پڑتی تو ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی اور وہ تیزی سے بیڑیوں کا پتہ کاٹنے میں لگ جاتیں۔ رات کے سناٹے میں ان کی قینچی کی آواز دور دور تک گونجتی رہتی۔

ایک دن دوپہر کو جب شکیل عائشہ کے گھر آیا تو سعیدہ بیگم جھنجھلائی ہوئی تھیں۔ شکیل نے پوچھا۔

"کیا بات ہے امّی، آج آپ کا موڈ اچھا معلوم نہیں ہو رہا۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے...... میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" سعیدہ بیگم نے کہا اور شکیل کو ساتھ لے کر وہ اندر کمرے میں چلی گئیں۔ جب عائشہ بھی آ گئی تو سعیدہ بیگم کہنے لگیں۔

"بھئی شکیل میاں...... میں کوفتے بہت شاندار بناتی ہوں۔ جاوتری جائفل ڈال کر ایسے بناتی ہوں کہ آدمی انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔ آج موسم میں کچھ ایسی خوشبو ہے کہ صبح سے ہی میں سوچ رہی تھی کہ آپ کو کوفتے بنا کر کھلاؤں۔ لیکن کوئی قیمہ لانے والا ہی نہیں مل رہا......"

"یہ بھی کوئی بات ہوئی امّی، ابھی قیمہ آجاتا ہے۔"

"نہیں میاں۔ آپ اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو کر قصائی کی دکان پر جائیں گے۔"

"امّی آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتی ہیں۔ آپ نے اور عائشہ نے مجھے اتنا پیار دیا ہے کہ میں آپ لوگوں کے لئے قصائی کی دوکان تو کیا، جہنم میں بھی ہنسی خوشی چلا جاؤں گا۔"

"جہنم میں جائیں تمہارے دشمن۔ ہم غریبوں کو تم اتنا سمجھتے ہو۔ جی چاہتا ہے کہ تم پر قربان ہو جاؤں۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔"

شکیل یہ کہہ کر قیمے کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ اس کے جملے سعیدہ بیگم کے

کانوں میں رس گھولنے لگے۔ وہ جنت کی سیر کرنے لگیں اور عائشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ''جیتی رہو بیٹی...... تم بہت قسمت والی ہو۔ جلد از جلد تمہاری شادی ہو جائے۔ میری بس یہی آرزو ہے۔''

کچھ دیر بعد شکیل قیمہ لے آیا۔ سعیدہ بیگم قیمہ لے کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ شکیل اور عائشہ اپنی کوٹھری میں ایک دوسرے پر قربان ہونے کی قسمیں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس بات سے بے نیاز کہ اس مکان میں ایک تاریک کوٹھری اور بھی ہے جو بیڑی کے پتے اور تمباکو کی بدبو سے آلودہ ہے اور دو معصوم بچے پسینے میں شرابور اس میں بیٹھے بیڑیاں بنا رہے ہیں۔ پتے اور تمباکو کا زہر آہستہ آہستہ ان کے پھیپھڑوں کو برباد کر رہا ہے۔ لڑکا اپنی بہن سے کہتا ہے۔

''باجی...... کیا یہ شکیل بھائی بہت بڑے آدمی ہیں؟''

''ہاں۔''

''کیا بیڑیاں بنانا بُرا کام ہے؟''

''معلوم نہیں۔''

''باجی...... امی عائشہ باجی ہی کو پیار کیوں کرتی ہیں؟ ہمیں کیوں نہیں؟ کیا ہم بُرے ہیں؟''

''نہیں...... ہم بھی اچھے ہیں اور تو تو بہت ہی اچھا ہے۔ امی ہمیں بھی پیار کرتی ہیں۔''

''پھر ہمیں قیدیوں کی طرح کیوں ڈال رکھا ہے؟''

''تو ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟''

''اچھا باجی، میں جب بڑا ہو جاؤں گا نا تو بہت سے پیسے کماؤں گا اور آپ کے لئے بڑے بڑے پھولوں کی شاندار قمیص شلوار لے کر آؤں گا۔'' یہ سن کر لڑکی کے آنسو ٹپ ٹپ بیڑیوں کے صوف میں گرنے لگے اور تمباکو کو گیلا کرنے لگے کہ اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ سعیدہ بیگم باورچی خانے ہی میں سے چلائیں۔

''کم بخت کھانے پکانے کا بھی تو چین نہیں۔ جب دیکھو حلق کے داروغہ چھاتی پر چڑھے رہتے ہیں۔ ابھی کنڈی لگائی تھی کہ پھر آ گیا کوئی کھٹ کھٹ کرنے۔ ارے کون ہے؟ آتی ہوں......''

سعیدہ بیگم بکتی جھکتی پیر پٹختی ہوئی دروازے پر پہنچی تو آنے والا کبھی کا رفو چکّر ہو چکا تھا۔ سعیدہ بیگم نے چین کی سانس لی اور کوفتوں کا مصالحہ بھوننے میں لگ گئیں۔

''اِتنی دیر سے خالی گلاس کو ہاتھ میں گھما رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟ کیا سوچ رہے ہیں؟''

عائشہ کی آواز نے میری سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا اور میں ہوٹل کے اپنے ایئر کنڈیشن کمرے میں واپس آ گیا۔ ''اوہ...... بس یوں ہی دماغ نیم کے پیڑ کی چھاؤں میں چلا گیا تھا۔''

''اچھا عائشہ، یہ بتاؤ تم پڑھی لکھی ہو یا نہیں؟''

''نہیں، میں پڑھی لکھی نہیں ہوں اور میں آشا ہوں، عائشہ نہیں۔''

میں نے ایک اور لمبا پیگ بنایا۔ بوتل کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ بوتل تلی پکڑ چکی ہے۔ گلاس میں برف ڈالا، سوڈا ڈالا اور سامنے بیٹھی لڑکی کی آنکھوں میں غوطہ لگا کر پھر اپنے چھوٹے سے شہر میں سعیدہ بیگم کے گھر پہنچ گیا۔

عائشہ کو شکیل کے پیار پر مکمل یقین تھا اور سعیدہ بیگم بھی مطمئن تھیں کہ چڑیا جال میں پھنس گئی ہے۔ دیر سویر شادی بھی ہو جائے گی کہ ایک دن شکیل نے سعیدہ بیگم سے کہا۔

''امّی، میں عائشہ کو عرس دکھانے کے لئے لے جانا چاہتا ہوں...... آپ اجازت دے دیں۔''

''ایسا ہے بیٹا، یہ چھوٹا سا شہر ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں، ویسے ہی بدنام ہو چکے ہیں کہ ہمارے گھر شکیل کا کچھ چکر چل رہا ہے۔ اگر کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو ہم تو مر جائیں گے۔ آپ عائشہ سے شادی کر لو، پھر جہاں جی چاہے لے جانا۔''

''امّی آپ یقین کریں، میرا وعدہ پتھر کی لکیر ہے۔ میں عائشہ ہی سے شادی کروں گا۔ اگر آپ نے مجھے عائشہ کو عرس میں لے جانے کی اجازت نہ دی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا کہ آپ مجھ پر قطعاً بھروسا نہیں کرتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، آپ رات کو آنا لیکن کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ عائشہ کو گھمانے لے گئے ہیں۔''

''بے فکر رہیئے، میں رات کو نو بجے کے آس پاس آؤں گا۔ اس وقت لائٹ بھی غائب ہوتی ہے...... عائشہ تم تیار رہنا۔''

''جی...... امی جیسا کہیں گی۔''

''امی ہی کا حکم ہے کہ آج آپ ہمارے ساتھ عرس دیکھیں۔''

''لیکن واپس کب تک آؤ گے؟''

''ہم جلد ہی واپس آجائیں گے۔''

''بہت جلد واپس آجانا بیٹا۔''

''ٹھیک ہے۔''

رات کو ٹھیک نو بجے شکیل اپنی موٹر سائیکل پر آیا، اس نے ہارن بجایا۔ پہلے سے ہی تیار بیٹھی عائشہ کو ماں نے کچھ سمجھایا اور شکیل کی موٹر سائیکل پر بیٹھا دیا۔

شکیل کی موٹر سائیکل بہت جلد شہر سے نکل کر لمبی چوڑی سڑک پر فرانٹے بھرنے لگی۔ تقریباً دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد موٹر سائیکل ایک باغ میں داخل ہوئی۔ جہاں شکیل کے باپ نے عیش کرنے کے لئے ایک شاندار کوٹھی بنائی ہوئی تھی۔ کئی ملازم وہاں ہر وقت رہا کرتے تھے۔ شکیل اپنی شاندار کوٹھی کے ایک کمرے میں عائشہ کو لے کر پہنچا تو عائشہ کہنے لگی۔

''آپ یہ کہاں لے آئے؟ ہم تو عرس میں جانے والے تھے۔''

''عرس...... ہاہاہا...... میں ڈل جھیل کی سیر تو تمہیں شادی کے بعد ہی کراؤں گا۔ جہاں تم جین جیکٹ پہن کر میرے پہلو میں بیٹھو گی۔ فی الحال اس کو ڈل جھیل کا

شکارا سمجھو۔" یہ کہہ کر شکیل عائشہ پر چھاتا چلا گیا۔ جنگل کا سناٹا...... شکیل کی مضبوط بانہوں کا گھیرا...... گرم گرم سانسیں...... جوان جسموں میں بجلیاں پیدا کرتا ہوا لمس ...... عائشہ کو اپنے پیار پر بھرپور یقین...... دور دور تک خاموشی۔ سب نے مل کر عائشہ کو موم کی طرح پگھلا دیا۔ وہ پگھلتی چلی گئی...... پگھلتی چلی گئی۔

رات تین پہر ڈھل چکی تھی۔ روشن ستارے جھپکیاں لینے لگے تھے کہ شکیل کی آنکھ کھلی۔ اس نے جلدی سے گھڑی دیکھی، رات کے چار بج رہے تھے۔ اس نے عائشہ کی طرف دیکھا جو بے فکر شکیل کے پہلو میں سوئی ہوئی تھی۔ شکیل کا دل پھر بے ایمان ہوا۔ لیکن اسے لگا کہ وہ تھک چکا ہے۔ اس نے بڑی بے رحمی سے عائشہ کو جگایا۔

"کیا یہیں سوتے رہنے کا ارادہ ہے...... اُٹھو۔"

عائشہ کو شکیل کی آواز اجنبی سی لگی۔

"چلو جلدی کرو۔"

عائشہ اپنے کپڑوں کو درست کرتی ہوئی موٹر سائیکل پر پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر سائیکل فراٹے بھرنے لگی اور عائشہ کو اپنے آپ کو سنبھالنے میں دقت ہونے لگی۔ شاید اس کی گردن میں بھی جھٹکا آ گیا۔ وہ شکیل کے رویے سے بھونچکی رہ گئی تھی۔ اس نے ہمت کر کے شکیل سے کہا۔

"آپ موٹر سائیکل کیسے چلا رہے ہیں؟ کچھ میرا بھی خیال کیجئے......"

"چپ چاپ بیٹھی رہو۔"

شکیل نے ڈپٹنے کے انداز میں کہا تو عائشہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے......

اِدھر سعیدہ بیگم نے پوری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ ہر لمحہ وہ خوفزدہ ہو رہی تھیں۔ جیسے جیسے رات آگے بڑھ رہی تھی ویسے ویسے انہیں اپنی نیا ڈوبتی لگ رہی تھی۔ وہ اس خیال ہی سے کانپ گئی تھیں کہ عائشہ معصوم، بھولی بھالی

ہے، انہیں بھی ان دونوں کے ساتھ جانا چاہئے تھا۔ انہیں اپنی بھول کا شدید احساس ہو رہا تھا اور ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا سینا پیٹنا شروع کر دیں کہ گلی میں موٹر سائیکل رُکنے کی آواز آئی۔ ایک لمحہ کو موٹر سائیکل رکی اور چلی گئی۔ سعیدہ بیگم دروازے کی طرف دوڑیں۔ دیکھا...... بال بکھرائے کانپتی ہوئی عائشہ چلی آرہی ہے۔ ماں کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں نے جلدی سے اسے گھر کے اندر کیا اور پھس پھسائیں۔

''کم بخت یہ تونے کیا کیا؟ حرام زادی کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رکھا۔ قطامہ جا چپ چاپ اپنے بستر میں جا کے مر جا۔''

اس کے بعد ایک دن...... دو دن...... تین دن گزر گئے لیکن روز کا آنے والا شکیل نہیں آیا۔ چوتھے دن دوپہر کو شکیل آیا تو سعیدہ بیگم کو اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔

''کہاں رہے شکیل میاں...... تین دن سے غائب ہو؟''

''ابا نے کام سے باہر بھیج دیا تھا۔''

''عائشہ دیکھو، شکیل میاں آئے ہیں۔''

سعیدہ بیگم نے کہا اور شکیل کے پاس کھڑی ہوگئیں۔ کچھ دیر کے بعد بولیں۔

''شکیل میاں...... میں بہت اہم بات آپ سے کہنے جا رہی ہوں۔'' سعیدہ بیگم نے اپنا گلا صاف کیا اور بولیں۔

''آپ عائشہ کے ساتھ بدنام ہو چکے ہیں۔ لہٰذا آپ کم سے کم اپنی والدہ کو بھیج کر رشتہ تو پکّا کر لیں۔''

''کمال کر رہی ہیں امی آپ بھی۔ ہم اکیسویں صدی میں جانے والے ہیں۔ فلمی دنیا والوں کو دیکھئے۔ نہ شادی نہ بیاہ اور لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بلکہ بنا شادی کے بچے بھی پیدا کر لیتے ہیں...... ہم لوگوں کے بھی ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں...... شادی جب ہوگی تب ہوگی۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ میرے پاس لاکھوں کی دولت ہے۔ آپ یقین کریں کہ جو بھی آپ کو چاہئے وہ آپ کی خدمت میں

حاضر کر دیا جائے گا۔ مجھے اور عائشہ کو آپ عیش کرنے دیں......''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا میں اپنی بیٹی کی دلالی کھاؤں گی۔''

''جو بھی آپ مناسب سمجھیں وہ نام دے لیں۔''

''کُتے کے پلّے تیری اِتنی ہمت کہ تو مجھے دلالی کھانے کو کہے۔ دفعان ہو جا میرے گھر سے کمینے...... دفعان ہو جا۔''

''بڑھیا کھوسٹ یہ تو ہمارا بڑپن تھا کہ شکیل احمد خاں نے ایک حقیر چپراسی کی بیٹی کو اپنی محبوبہ بنانا منظور کیا، ورنہ تو ایسی سیکڑوں عائشائیں میرے جوتے کی نوک پر رہتی ہیں۔''

یہ کہہ کر شکیل چلا گیا اور سعیدہ بیگم گالیاں بکتی رہ گئیں۔ انہیں لگا کہ آسائشیں حاصل کرنے اور سماج کی باعزت اور باوقار عورت بننے کا ان کا خواب شکیل اپنے پیروں تلے روند گیا ہے۔

اس کے بعد کچھ ماہ یوں ہی گزر گئے۔ پھر محلّہ کے لوگوں میں یہ چرچہ عام تھی کہ آج کل سعیدہ بیگم الطاف حسین خاں کو کوفتے کھلا رہی ہیں۔ کچھ دنوں بعد الطاف حسین خاں بھی غائب ہو گئے تو بدرالدین کو سعیدہ بیگم کے گھر آتے جاتے دیکھا گیا۔

اس بیچ عائشہ کی چھوٹی بہن جو کہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی، ایک دن ایسی سوئی کہ پھر کبھی نہ اُٹھی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ عائشہ بھی غائب ہو گئی ہے۔ سعیدہ بیگم نے لوگوں کو بتایا کہ انہوں نے اپنی کراچی والی بہن کے لڑکے کے ساتھ عائشہ کی شادی کر دی ہے اور وہ وہاں بہت خوش ہے۔ یوں بھی چھوٹے شہروں میں رکھا ہی کیا ہے۔

پھر محلّہ کے لوگوں نے دیکھا کہ سعیدہ بیگم اپنے گھر کے صحن میں نیم کے پیڑ کے نیچے جھلنگا ڈالے...... کوّے ہکنی ہو گئی ہیں۔ ان سے کوئی بھی ملنے نہیں آتا اور وہ خود کہیں جانے کے قابل رہی نہیں ہیں۔

کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر بیرا کھانے کی ٹرے لایا تو میری سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

''لو بھئی عائشہ کھانا آ گیا۔'' میں نے کہا تو وہ کہنے لگی۔

''آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ اتنی دیر سے جانے کیا سوچ رہے ہیں..... اور مجھے بار بار عائشہ ہی کہتے ہیں۔ اتنے پیسے آپ نے خرچ کئے ہیں، بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئیے اور آرام سے سوئیے جناب۔''

میں نے اپنے گلاس میں شراب کے آخری قطرے ڈالے۔ بوتل ختم ہو چکی تھی۔ میری آنکھیں بھی اب دیکھنے لائق نہ رہی تھیں۔ عائشہ کا چہرہ میرے فوکس سے باہر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس اُٹھایا تو اس نے مجھے روک دیا۔ کھانے کے نوالے بنا بنا کر اس نے میرے منہ میں دیئے۔ کچھ لقمے اس نے خود بھی کھائے۔ میں نے اپنا گلاس خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور عائشہ کو اپنے بازوؤں میں بھر کر بستر پر گھسیٹ لیا۔ پھر اس کے وجود میں سمانے کی کوشش میں میں لڑھک گیا تھا اور سو گیا تھا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو سب سے پہلے گھڑی دیکھی۔ مجھے جلد سے جلد گوا پہنچنا تھا۔ میں فوراً ہی اپنے بستر سے نیچے کود آیا۔ دیکھا لڑکی غائب ہے۔ جلدی سے باتھ روم کھولا، وہ خالی تھا۔ لڑکی بغیر بتائے کہاں غائب ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اپنا کیش چیک کیا۔ دوسری چیزوں کو دیکھا لیکن سب صحیح سلامت تھیں۔ میں جلدی جلدی نہا دھو کر گوا جانے کی تیاری کرنے لگا۔ بیرے کو بل لانے کو کہا۔ اپنا سارا سامان سوٹ کیس میں بھرا۔ سب چیزیں رکھنے کے بعد ایک نگاہ کمرے پر ڈالی کہ کہیں کچھ رہ تو نہیں گیا۔ ٹیبل پر صرف منٹو کا مجموعہ رکھا تھا۔ مجموعے کے اوپر ریڈ نائٹ کی بوتل رکھی تھی۔

میں نے اپنا سوٹ کیس بند کیا اور جیکٹ کی جیب میں کتاب رکھنے کے لئے اُس کے اوپر سے ریڈ نائٹ کی بوتل ہٹائی تو میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ مجموعے کے اوپر پانچ پانچ سو کے چار نوٹ رکھے تھے۔ ○○

برف بیچنے والا

○

چھٹی کا گھنٹہ بجتے ہی اسکول کے سارے بچے اپنے بستوں کو کندھوں پر ڈال کر اسکول سے باہر کی طرف دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ کرتار اور احمد بھی اپنے بستے اُٹھائے اسکول سے بھاگتے ہیں اور اسکول کے سامنے والا میدان پار کر کے جب وہ سڑک پر پہنچتے ہیں تو اُن کی سانسیں پھول چکی ہوتی ہیں۔ مئی کے مہینے کا دوسرا ہفتہ تھا...... فصلیں کٹ چکی تھیں۔ اب دور دور تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔ 'لُو' کے تیز جھونکوں کے ساتھ کٹیلے کے سوکھے ہوئے جھاڑ اِدھر سے اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے...... ہریالی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ کھیتوں سے دھول اُڑ رہی تھی۔ لُو کے جھکڑ اور گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے پرندوں نے پیڑوں کے کھوکھلے ٹھونٹھوں میں پناہ ڈھونڈھ لی تھی۔ دونوں لڑکے ننگے پاؤں تھے اور ان کے کپڑوں میں جگہ جگہ پیوند لگے تھے۔ سڑک پر پہنچ کر وہ آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ احمد نے کرتار سے کہا۔

''یار کرتار! سر سے کپڑا باندھ لے۔ دو کوس کا سفر ہے اور لُو کے جھکڑ شروع ہو چکے ہیں۔''

''بات تو تو ٹھیک کہتا ہے یار! ایسا کرتے ہیں کہ کپڑے کو پانی میں بھگو کر باندھ لیتے ہیں۔''

''ارے یار! پانی کا بھیگا ہوا کپڑا ابھی کتنی دیر چلے گا۔ لُو تو بہت تیز چل رہی

ہے۔ چل ایسے ہی سوکھا ہوا کپڑا کانوں سے کس کے لپیٹ لے۔ کہاں پانی وانی میں بھگوتا پھرے گا۔''

''چل ٹھیک ہے......تو بھی باندھ لے کس کے۔''

''یار کرتار! یہ مئی کا مہینہ بھی بڑا بُرا ہوتا ہے۔ سارے میں دھوپ ہی دھوپ، دھوپ ہی دھوپ دکھائی دیتی ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔''

''ہاں یار۔ پیاس لگے تو دور دور تک کہیں پانی بھی نہیں ملتا۔ اوپر سے دو کوس پیدل چل کر اسکول آؤ اور ٹیکم ٹیک دوپہر میں گھر کو جاؤ۔''

''اچھا کرتار، یہ بتا یار! کچھ دنوں کے بعد اپنی گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں نا، میں تو جاؤں گا اپنی نانی کے گاؤں۔ تو بتا، تو کہاں جائے گا؟''

''ارے یار، میں کہاں جاتا۔ چھٹیاں ہوں گی تو میں بھی ماں اور باپو کے ساتھ سرپنچ کی نوکری میں لگ جاؤں گا۔ اس کی بھینسوں کو سانی دوں گا اور ندی پر نہلا کر لایا کروں گا۔''

''کرتار! تو ایسا کر، اس بار میرے ساتھ میری نانی کے گھر چل...... وہاں تجھے بہت سارے تربوز، خربوزے اور آم کھانے کو ملیں گے۔ میری نانی روزانہ ہی ڈھیروں ڈھیر آم اور خربوزے منگاتی ہے۔ تو میرے ساتھ چلنا، میں تجھے خوب کھلاؤں گا۔ بڑا مزا آتا ہے نانی کے گھر۔ کبھی دن دن بھر باغ میں 'لبا داس' کھیلتے ہیں، تو کبھی ڈَیر میں مچھلیاں پکڑتے ہیں، تو کبھی ندی پہ جاکے پیرتے ہیں۔''

''احمد! تیری نانی کا گاؤں تو بہت اچھا ہے یار! وہاں پر برف بیچنے والا بھی آتا ہے کیا؟''

''ہاں...... ہاں آتا ہے۔''

''اپنے گاؤں میں جو برف والا آتا ہے، وہ تو بہت ہی اچھا آدمی ہے۔ لیکن یار یہ جو اپنے اسکول کے دروازے پر کھڑا ہو کر برف بیچتا ہے نا، یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ ہم کہیں کہ بھئی دس پیسے والی آئس کریم دے دو، پیسے کل کو دے دیں گے، تو

کبھی نہیں دے گا...... اور وہ داروغہ کی لڑکی جو اپنی کلاس میں پڑھتی ہے، اسے فوراً چار آنے والی نکال کر دے دیگا...... اور کبھی پیسے بھی نہیں مانگے گا اس سے۔ لیکن یار اپنے گاؤں میں جو برف بیچنے والا آتا ہے، وہ تو بہت ہی اچھا آدمی ہے۔ پیسے ہوں، نہ ہوں، برف دے دیتا ہے اور خود ہی کہتا ہے، کوئی بات نہیں کل کو دے دینا پیسے۔''

''بات تو تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔''

''یار گرمی کتنی پڑ رہی ہے۔ سڑک پر چلتے ہوئے تو پاؤں جلتے ہیں۔''

''کچے میں تُو چل یار۔ اُدھر جامن اور شیشم کے پیڑوں کی چھاؤں ہے نا، اس لئے پاؤں نہیں جلیں گے۔''

''اپنے گاؤں والی لیک پر ریت بہت گرم رہتی ہے، اسے پار کرتے ہوئے ہر بار ایسا لگتا ہے جیسے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں گے۔''

''اُس لیک پر کوئی پیڑ تو ہے نہیں، اور پورا راستہ ریتیلا ہے۔ اسی لئے وہ بہت گرم رہتی ہے۔''

''احمد! دیکھ نا یار، کھیتوں سے چنگاریاں سی اُٹھتی ہوئی لگ رہی ہیں، اور سڑک بھی ایسی لگ رہی ہے جیسے پگھل گئی ہو۔''

''ہاں! تو ٹھیک کہہ رہا ہے...... اچھا ایک بات بتا، جب تو اس دھوپ میں جلا بھنا لٹلٹاتا ہوا گھر پہنچتا ہے تو تیری ماں کیا دیتی ہے کھانے کو؟''

''کیا دیتی یار کھانے کو...... گھر میں کوئی انتظار بھی نہیں کرتا کہ میں اتنی دور سے، اس دوپہر میں پیدل چل کر اسکول سے پڑھ کر آرہا ہوں گا۔ ماں اور باپو دونوں ہی سو جاتے ہیں۔ وہ بھی کھیتوں میں کام کرتے کرتے تھک جاتے ہوں گے۔ میں تو خود ہی آلے میں سے روکھی سوکھی روٹی نکال کے کھا لیتا ہوں۔ کبھی کبھی تو چٹنی بھی مجھے ہی کرنی پڑتی ہے۔!''

''تو ٹھیک کہتا ہے یار، گھر پر کوئی بھی تو انتظار نہیں کرتا کہ ہم اسکول سے آرہے ہوں گے، اور کبھی اگر غصہ کرو، تو سب کہیں گے کہ پڑھ رہے ہو تو کس پر

احسان ہے۔ جب پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤ گے تو پوچھو گے بھی نہیں ہم کو......''

''احمد، کچھ دیر بیٹھ کر آرام کر لیں!''

''نہیں، ابھی نہیں...... آگے والی پلیا پر چل کر بیٹھیں گے۔ وہاں پر بڑ کا پیڑ کھڑا ہے نا، اس کی چھاؤں میں بیٹھیں گے۔''

''یار، دور دور تک بھی تو کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ اگر ایسے میں ہمیں کوئی پکڑ کر لے جائے تو، یا کوئی بھیڑیا ویڑیا آجائے تو......؟''

''کرتار، تو ڈرتا کیوں ہے؟ اس دوپہر میں اور لُو میں تو کوئی باہر نکل نہیں سکتا ......اور پھر دور دور تک صاف پڑے کھیتوں میں بھیڑیا کہاں سے آئے گا؟''

''لیکن یار مجھے اس بھائیں بھائیں کرتی دوپہر میں ڈر لگتا ہے۔ سنا ہے منّا چھل اور چڑیلیں ایسی دوپہریا میں ہی باہر نکلتی ہیں اور بچوں کو چپٹ جاتی ہیں۔ پھر ماں کہتی ہے کہ ایسی دوپہر میں ہی چیل انڈا چھوڑتی ہے۔''

''ارے یار چھوڑ نا، تو ایسی باتیں کیوں کرتا ہے۔ ہم روز ہی اس راستے سے آتے ہیں اور اسی راستے سے واپس جاتے ہیں۔ اچھا تو یہ بتا کہ تو پڑھ لکھ کر کیا بنے گا......؟''

''میں...... میں یار احمد! برف بیچنے والا بنوں گا...... وہ اپنے گاؤں میں جو برف بیچنے والا آتا ہے نا، کتنی اچھی سائیکل ہے اس کی۔ سائیکل کے پیچھے برف سے بھری پیٹی رکھی رہتی ہے...... اور یار، سائیکل کے ڈنڈے میں ٹاٹ کے دو جھولے ٹنگے ہوتے ہیں، جن میں ناج ہی ناج (اناج) بھرا رہتا ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے نا، جب برف والا ہورن بجاتا ہے اور آواز لگاتا ہے...... ''ٹھنڈا میٹھا برف، ملائی والا برف'' اور پھر سارے گاؤں کے بچے اس کے پاس جمع ہو جاتے ہیں۔ کچھ آئس کریم کھاتے ہیں اور کچھ کھڑے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں۔ کتنا اچھا ہے نا! گاؤں گاؤں جا کر برف بیچو۔ شام کو ڈھیر سارا اناج جھولوں میں بھر کے گھر کو لاؤ، اور دوپہر کو اگر پیاس لگے تو خوب جی بھر کے برف کھاؤ۔ نہ پیسے دینے پڑیں، نہ کچھ...... لیکن یار احمد، کسے معلوم کہ میں برف بھی بیچ سکوں گا کہ نہیں؟ کیوں کہ باپو

تو میری شادی کر دینا چاہتا ہے۔ باپو سے جتنے لوگ بھی ملنے آتے ہیں نا، سارے کے سارے ایک ہی بات کہتے ہیں کہ 'پڑھ لکھ کر بالک حرامی ہو جاتے ہیں، ان سے نہ تو کھیتوں میں کام ہی ہوتا ہے اور نہ انہیں نوکریاں ہی ملتی ہیں۔ بس سالے کھڑے ہو کے موتنا سیکھ جاتے ہیں۔' میرا باپو تو اگلے برس میری شادی کر دیگا اور دو سال بعد گونا...... پھر میں سرپنچ کے کھیتوں ہی میں کام کروں گا...... اور کیا کروں گا؟ اچھا تو بتا، تو پڑھ لکھ کر کیا بنے گا؟''

''میں...... میں تو یار فوج میں جاؤں گا، فوجی بنوں گا۔''

''مجھے تو یار زوردار پیاس لگ رہی ہے۔''

''پیاس تو مجھے بھی لگ رہی ہے...... آگے پلیا کے سامنے جو ریلوے کا پُل ہے نا، اس کے پاس ہی ایک کنواں ہے۔ اس میں سے پانی نکال کر پیئیں گے۔''

''لیکن ہم اس میں سے پانی نکالیں گے کیسے......؟''

''تو فکر مت کر۔ پُل کے پاس ایک چوکیدار رہتا ہے، اس سے بالٹی لے لیں گے اور کنویں میں سے پانی نکال لیں گے۔''

''اور اگر چوکیدار کے پاس بالٹی نہ ہوئی، یا رسی نہ ہوئی تو......؟''

''ارے یار کرتار! چوکیدار بھی تو کسی نہ کسی طرح پانی بھرتا ہی ہوگا، اور اگر اس کے پاس کچھ بھی نہ ہوا تب بھی کوئی بات نہیں۔ پُل کی مرمت کے لئے وہاں پر ایک بہت بڑی سیڑھی لگی ہوئی ہے۔ ہم دونوں اس سیڑھی کو اٹھا کر کنویں میں ڈال دیں گے اور اس سے کنویں کے اندر اُتر کر پانی پی لیں گے۔''

''لیکن تجھے کیسے معلوم کہ وہاں سیڑھی بھی ہے اور چوکیدار بھی......؟''

''میں ایک دن اپنے بھائی کے ساتھ پُل پر گیا تھا۔ تب میں نے دیکھا تھا کہ ایک مزدور سیڑھی اندر ڈال کر پانی نکال رہا تھا۔ وہ کنواں بھی زیادہ گہرا نہیں ہے۔''

''لیکن یار مجھے تو ڈر لگتا ہے۔''

''ارے یار تجھے تو ہر بات سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور ہاں سُن! ہم لوگ پلیا پر

بیٹھ کر زیادہ دیر آرام بھی نہیں کریں گے۔ کیوں کہ راستے میں جو آموں کا باغ پڑتا ہے، اس میں سے چھوٹی چھوٹی ابیاں چگ کر گھر لے چلیں گے اور ان کی چٹنی کر کے کھائیں گے۔ بڑا مزا آتا ہے آمیوں کی چٹنی میں۔''

''ہاں، ہاں، ضرور لے چلیں گے...... اچھا احمد یہ بتا، وہ برف بیچنے والا تیرے گھر کے پاس کتنی دیر رکتا ہے؟''

''وہ تو وہاں گھنٹوں کھڑا رہتا ہے...... ہورن بجاتا ہے اور 'ٹھنڈا میٹھا ملائی والا برف' کی آوازیں بھی لگاتا رہتا ہے۔''

''تو کتنی آئس کریمیں کھاتا ہے؟''

''ارے یار! میرا بس چلے تو میں اس کی پیٹی میں بھری ہوئی ساری کی ساری آئس کریمیں کھا جاؤں۔ لیکن یار، اپنے پاس پیسے نہیں ہوتے نا، اس لئے کبھی کبھی تو ایک بھی کھانے کو نہیں ملتی۔''

''پیسے نہیں ہوتے تو کیا ہوا، وہ اناج کے بدلے میں بھی تو برف دے دیتا ہے، اور خوب ڈھیر سارا دے دیتا ہے۔''

''ہاں دیتا تو ہے۔ لیکن ماں اناج بھی نہیں لے جانے دیتی ہے۔ ویسے میرا موقع لگتا ہے تو میں چپکے سے اناج لے جاتا ہوں اور خوب آئس کریمیں کھاتا ہوں۔ تو بھی خوب کھاتا ہوگا؟''

''کہاں یار! میرے گھر میں نہ تو اناج ہی ہے اور نہ پیسے۔ میں تو بس دوسروں کو کھاتا ہوا ہی دیکھتا رہتا ہوں۔ مجھے تو کبھی کبھار ہی ملتی ہے کھانے کو...... سنا ہے احمد، چار آنے والی آئس کریم بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس میں نری ملائی ہی ملائی ہوتی ہے۔ تو نے کھائی ہے کبھی؟''

''نہیں یار، چار آنے والی میں نے کبھی نہیں کھائی، لیکن سنا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ یار کرتار، اس برف والے کو کبھی گرمی نہیں لگتی؟ کیسی ہی دھوپ ہو، کیسی ہی لُو چل رہی ہو...... یہ اپنا ہورن بجاتا پھرے گا۔ اِس گاؤں سے اُس گاؤں......

اُس گاؤں سے اِس گاؤں، اور یار میرے ابا بتا رہے تھے کہ یہ ندی کے اس پار کا ریتا پار کر کے اُدھر کے گاؤں میں بھی جاتا ہے برف بیچنے۔ نہ اس کے پاؤں جلتے ہیں، نہ ہی اس کا سر گرم ہوتا ہے۔''

''ارے یار احمد، تو کیا ہوا، اگر وہ ندی کے پار والے گاؤں میں جاتا ہے تو، ناج بھی تو ڈھیر سارا لاتا ہوگا اکٹھا کر کے، اور پیسے بھی ملتے ہوں گے۔ ایک ہم لوگ ہیں، ہم روز اسکول کو پیدل جاتے ہیں اور دوپہر میں اسکول سے پیدل آتے ہیں۔ ہمیں تو نہ ناج ہی ملتا ہے، نہ پیسے ہی۔ ہاں کبھی کبھی باپو کے دو چار تھپڑ ضرور کھانے کو مل جاتے ہیں۔''

''یہ بات تو تو ٹھیک کہتا ہے۔ پھر بھی اپنا برف بیچنے والا بہت ہی اچھا آدمی ہے۔ لیکن یار اپنے گاؤں میں وہ کالیا پہلوان ہے نا، وہ تو بہت حرامی آدمی ہے۔ میں ایک دن کی سناؤں تجھے کیا ہوا...... اس دن ٹھیکم ٹیک دوپہر تھی، میں ماں کے پاس چپ چاپ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا اور برف بیچنے والا ہورن پہ ہورن بجا رہا تھا۔ ''ملائی والا برف، ٹھنڈا میٹھا برف'' ...... کی آوازیں لگا رہا تھا۔ میری نیند تو تھی کوسوں دور، جب ماں سو گئی اور لمبے لمبے خراٹے لینے لگی تو میں چپکے سے اٹھا، ہولے سے کواڑ کھول کے باہر آیا اور باہر والے دروازے کی جھری میں سے باہر جھانک کے دیکھا تو یار کرتار، برف بیچنے والے کے پاس ایک بھی بچہ نہ تھا...... کالیا پہلوان اور اس کے دو ساتھی بیٹھے ہوئے مفت کا برف کھا رہے تھے۔ بیچارہ برف والا تپتی ہوئی دھوپ میں ننگے پاؤں کھڑا بار بار اِدھر اُدھر کو دیکھ رہا تھا کہ کوئی بچہ آئے۔ لیکن ایسی لُو لپٹ میں کون بچہ اپنے گھر سے نکل کے آتا۔ اِدھر کالیا کی ایک آئس کریم ختم ہوتی تو دوسری لے لیتا۔ برف والا ہاتھ جوڑ رہا تھا کہ بابو جی اب مت کھاؤ۔ اگر میرا سارا برف ایسے ہی ختم ہو گیا تو میں بیچوں گا کیا......؟ اس پر کالیا نے برف والے کے سر کا ایک ٹولا لیا اور اس سے بولا۔ ''ابے تجھے شرم نہیں آتی، یہ گندی سندی برف تو ہمارے گاؤں میں آ کر بیچتا ہے، جسے کھا کے ہمارے بچے بیمار پڑ جاتے ہیں، چل چار آنے والی نکال جلدی سے۔ آ جاتا ہے سڑا ہوا برف بیچنے

بدمعاش کہیں کا!'' یار میرا تو خون ہی کھولنے لگا بُری طرح سے ...... حالانکہ تجھے معلوم ہی ہے، میرے ابا برف والے سے کئی بار منع کر چکے تھے کہ بھئی جب یہ کچھ ذلیل لوگ تیرا برف مفت کھا جاتے ہیں تو بھیّا تو یہاں برف بیچنے مت آیا کر۔ کسی دوسرے گاؤں میں جا کر برف بیچ لیا کر۔ تو یار وہ برف والا ہر بار ایک ہی جواب دیتا، کہتا۔ ''اجی بھائی صاحب! ہر گاؤں میں پہلوان جیسے ایک دو آدمی موجود ہیں، تو پھر کون سا گاؤں چھوڑوں اور کون سا پکڑوں۔'' اور یار اس دن بھی کالیا چار آنے والی میں ایسے دبا کے چسکیاں مار رہا تھا جیسے اس کے باپ کا مال ہے۔ میں نے کیا کیا، چپکے سے مٹی کا ڈیلا لایا اُٹھا کے اور دیوار کی آڑ لے کر ایسا تاک کے مارا سالے کے کہ متھے پہ جا کے ٹن سے لگا۔ پھر کیا تھا، پورے گاؤں میں لٹھ لے کے گالیاں بکتا پھرا۔ ''کس نے مارا ہے، کس نے مارا ہے، میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اور میں تو ڈیلا مار کے چپکے سے ماں کے پاس جا کے سو گیا اور شام تک اٹھا ہی نہیں۔''

''اگر بیٹا احمد! کہیں کالیا کو پتہ چل جاتا کہ ڈیلا تو نے مارا ہے تو وہ تیری ٹانگیں چیر کے رکھ دیتا۔''

''ارے ہاں رکھ دیتا چیر کے......''

''اچھا یار، یہ برف والا جاڑوں میں کیا کرتا ہوگا۔ میرا مطلب ہے جب برف کا موسم ختم ہو جاتا ہوگا، تب یہ کیا کرتا ہوگا؟''

''یہ تو معلوم نہیں، لیکن میں نے ایک بار اس کو ایک گاؤں کی پینٹھ میں سنگاڑے بیچتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جاڑوں میں سنگاڑے بیچتا ہو...... کرتار! ذرا یار پاؤں کی حالت تو دیکھ، ریت میں چلتے چلتے کیسے ہو گئے ہیں۔''

''ہاں یار...... چلو اب باغ تو آنے ہی والا ہے۔''

''ہاں ہاں! کچھ دیر باغ میں آرام کریں گے اور آمبیاں چگ کر گھر لے جائیں گے۔ اچھا شام کو تو کبڈی کھیلنے آئے گا؟''

''ضرور آؤں گا۔''

O

چھٹی کا گھنٹہ بجتا ہے۔ بچے اپنے بستوں کو کندھوں پر ڈالے حسب معمول دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ بچے پورا میدان دوڑ کر ہی پار کر لیتے ہیں اور جب تک وہ ہانپنے نہیں لگتے، اس وقت تک دوڑتے رہتے ہیں۔ احمد اور کرتار بھی دوڑتے ہیں، لیکن کچھ ہی دور جا کر وہ دونوں رُک جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ چلنے لگتے ہیں۔ ہوا اتنی گرم چل رہی تھی، لگتا تھا جیسے کسی بھٹی میں سے ہو کر آ رہی ہو۔ آج دونوں لڑکے خاموش تھے۔ چپ چاپ اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ کچھ دور جا کر احمد نے کرتار کی طرف دیکھا۔ لیکن کرتار تو دور بہت دور سڑک کے آخری سرے کو دیکھ رہا تھا۔ احمد نے پھر کرتار کی طرف دیکھا اور ہولے سے اُسے آواز دی۔

"کرتار......!"

"ہوں......"

"تجھے کچھ معلوم ہے......؟"

"معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے؟"

"یہی کہ کل اپنا برف بیچنے والا مر گیا۔"

"کیسے مرا، تجھے یہ بھی معلوم ہے......؟"

"سُنا ہے اُسے لُو لگ گئی تھی۔ احمد، کسی دن ہمیں بھی لُو لگے گی اور ہم دونوں بھی اس سڑک پر یا لیک پر کہیں مرے پڑے ہوں گے۔"

"تجھے کرتار بس اتنا ہی معلوم ہے کہ اُسے لُو لگ گئی تھی۔"

"وہ کل دوپہر اپنی سائیکل پر برف کی پیٹی لادے ندی کے پار والے گاؤں کو جا رہا تھا۔ کل کتنی بھیانک لُو تھی یہ تو تجھے معلوم ہی ہے...... وہ ندی اتر کے ریتے میں اپنی سائیکل کو دھکیل کر لے جا رہا تھا کہ اسے وہیں پر کہیں لُو لگ گئی۔ کیوں کہ ...... وہ دن بھر کا بھوکا تھا، اسے روٹی نہیں ملی تھی۔"

''وہ بھوکا تھا؟ اسے روٹی نہیں ملی تھی؟ احمد! تجھے کیسے معلوم کہ وہ بھوکا تھا؟ وہ بھوکا کیسے ہوسکتا تھا۔ اس کے جھولوں میں تو ناج بھرا رہتا تھا۔ نہیں...... نہیں...... وہ بھوکا نہیں ہوسکتا تھا۔ تُو جھوٹ بولتا ہے۔''

''کرتار! تو میری بات سن۔ وہ سچ مچ بھوکا ہی تھا۔ میرے ابا بتا رہے تھے۔ اس نے میرے ابا کو بتایا تھا کہ وہ پورے دن کا بھوکا ہے۔ کیوں کہ وہ صبح سویرے ہی سارا اناج بیچ کے شہر چلا گیا تھا، برف لینے کے لئے۔ کل اپنے گاؤں کے برابر والے گاؤں میں شادی تھی نا، وہاں اسے برف بیچنا تھا۔ وہ اس گاؤں میں برف بیچ کر بہت خوش ندی پار والے گاؤں جا رہا تھا۔ وہاں بھی شادی تھی۔ جاتے ہوئے وہ پانی پینے کے لئے میرے ابا کے پاس رُک گیا تھا۔ ابا نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے رسّی بٹ رہے تھے۔ تب ہی برف والے نے ان سے آکر کہا کہ وہ صبح سے بھوکا ہے اور اسے زوردار پیاس لگی ہے۔ ابا نے اس سے بہت کہا کہ وہ اسے روٹی لا دیتے ہیں، تھوڑا بہت ٹکڑا کھالے، نہیں تو خالی پیٹ پانی کلیجے پہ جا کے لگے گا۔ لیکن وہ روٹی کھانے کو تیار نہ ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آج اس کی پوری پیٹی کا برف نقد بک جائے گا...... اور وہ شام کو سکون سے روٹی کھائے گا۔ ابا نے پھر بھی اس سے کہا کہ وہ کچھ اور کھالے، تیز لُو میں ندی پار نہ جائے۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور چلا گیا۔''

''احمد...... وہ سچ مچ ہی بھوکا تھا؟''

''ہاں یار! وہ سچ مچ ہی بھوکا تھا۔ بھلا میں کیوں جھوٹ بولوں گا؟''

سورج ٹھیک دونوں لڑکوں کے سروں کے اوپر تھا۔ دونوں خاموشی سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گاؤں کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ ان کے پیروں سے جو دھول اُڑ رہی تھی، وہ کبھی کبھار بگولوں کی شکل اختیار کر لیتی اور ان بگولوں میں کٹیلے کے پیڑ اڑتے ہوئے دور دور تک پھیل جاتے۔ ○○

تپش

دھوپ کی شدت سے تپتے ہوئے لق و دق صحرا میں میرے پاؤں دھنستے جارہے تھے۔ سورج کی تیز شعاعیں میرے پورے جسم کو جھلسائے دے رہی تھیں۔ پھر بھی میں اس سچائی کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں، کیوں کہ میرے پاس گھنیری چھاؤں والا مختصر لیکن شاندار ماضی ہے۔

میں اسی شاندار ماضی میں جیتا ہوں۔ اس سچائی کو کسی صورت ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ میں اور میرا پورا جسم لق و دق صحرا میں سورج کی تمازت سے جھلسے جارہے ہیں۔

بھئے جیت کمار گوڑ کا اور میرا ساتھ تقریباً پینتالیس سال پُرانا تھا۔ جس کے تانے بانے کچھ اس طرح بنتے ہیں کہ ہم دونوں نے لڑکپن ہنسی خوشی گذارا، جوانی میں قدم رکھتے ہی ایک دوسرے کی چاپلوسی کرنا شروع کر دی اور اس کے علاوہ کچھ دوسرے کام بھی شروع کر دئے جو ہمارے سنسکاروں میں شامل نہ تھے۔

مثلاً ایک بار یہ ہوا کہ ہم دونوں جوا کھیل رہے تھے۔ جوئے کی اطلاع پولیس کو ملی۔ پولیس آئی اور ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ پولیس والے مجھے ہی اپنے ساتھ تھانے لئے جارہے تھے اور بھئے جیت کمار گوڑ کا کہیں کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر غائب ہو گیا تھا اور پولیس اس بات پر ذرا بھی فکر مند نہ تھی کہ جوا تو ہم دونوں ہی کھیل رہے تھے، پھر صرف مجھے ہی کیوں تھانے لے جایا جارہا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ شاید بھئے جیت پولیس کو

چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا، اور میں اپنے سیدھے پن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا۔ لہٰذا اب یہ الزام بھی مجھ پر ہی لگے گا کہ میں جواری ہوں۔

تھانے پہنچتے ہی میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے معاملہ طے کیا اور ایک سو کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا تو اس نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ایک اور دے!''

میں نے جلدی سے سو کا ایک اور نوٹ نکالا اور پولیس والے کی طرف بڑھا دیا۔ پولیس والے کی انگلیاں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بھئے جیت کمار گوڑ کی انگلیوں سے ملتی جلتی تھیں۔ لیکن میں نے اسے اپنا وہم جانا اور نوٹ پولیس والے کے ہاتھ پر رکھ کر اُلٹے پیروں بھاگتا ہوا تھانے سے باہر نکل گیا۔

بعد میں بھئے جیت کمار سے ملاقات ہونے پر میں نے اس سے کہا۔ ''یار! مجھے اکیلا چھوڑ کر تو کہاں غائب ہو گیا تھا؟''

بھئے جیت کمار نے ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ ''دراصل میں تیری ہی رَکشا (حفاظت) کا اُپائے کرنے گیا تھا، پرنتو مجھے گیات ہوا کہ تو تھانے سے نکلنے میں سپھل ہو گیا ہے تو میں نے آگے جتن نہ کیا۔ اس بیچ تجھ سے بھینٹ بھی نہ ہوئی، نہیں تو تجھے گیات ہو جاتا کہ میں تیری ہی رکشا کے کارن وہاں سے غائب ہوا تھا۔ چل، جو ہوا سو ہوا۔ آ چلتے ہیں۔ ایک گھونٹ مدرا (شراب) کا اتاریں گے پھر نرتکی کا نرتیہ (ناچ) دیکھیں گے، اور یدی سنبھو (اگر ممکن) ہوا تو رات وہیں ویتیت کریں گے (گزاریں گے)۔ سندھیہ سے پربھات تک اپنی ولاس یاترا چلے گی۔ (شام سے صبح تک اپنا رنگ رلیوں کا سفر چلے گا)۔ آنند ہی آنند رہے گا!''

پروگرام چونکہ بہت ہی شاندار تھا، لہٰذا میں بھئے جیت کمار کے ساتھ ہو لیا۔ ہم دونوں ایک شراب خانے میں پہنچے۔ اگرچہ سورج ابھی ڈھلا نہیں تھا، پھر بھی ہم نے مان لیا تھا کہ سورج تو ڈھل ہی جائے گا، اب نہیں تو تھوڑی دیر میں۔ اس لئے ہم دونوں شراب خانے میں جا کر آرام آرام سے شراب پینے لگے۔ ہمیں ایسا محسوس ہو

رہا تھا جیسے ہم برسوں کے تھکے ہوئے ہیں۔

شراب پی کر ہم گانا سننے کوٹھے پر پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہاں میرے اور بھئے جیت کے سوا کوئی نہ تھا۔ ہمارے پہنچتے ہی کوٹھے پر ہلچل پیدا ہو گئی۔ کچھ سازندے اِدھر اُدھر دوڑے۔ اس کے بعد گھنگھروؤں کی آوازیں، ڈھولک کی تھاپ، کن سری گانے والیاں، بے ڈھنگی ناچنے والیاں، ان کے ساتھ ہم بھی اچھلنے کودنے لگے۔

پھر کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پُرسکون کوٹھے پر اودھم کٹنے لگا۔

اس کے بعد.........

باہر تیز سائرنوں کی آوازیں۔ کوٹھے پر بھاری بوٹوں کی آوازیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پولیس والوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ میں نے جلدی سے بھئے جیت کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ حیرت انگیز طور پر وہاں سے پھر غائب تھا۔

میری حیرانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کی کوٹھے پر داخل ہونے اور نیچے اُترنے کا ایک ہی دروازہ تھا اور اسے پولیس والوں نے مکمل طور پر گھیر رکھا تھا۔

پھر بھئے جیت کیسے غائب ہوا؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اس پہلو پر غور کرتا، ایک پولیس والے نے اپنی سنگین میری پسلی میں اڑا دی، اور شاید ایک لات بھی میری پیٹھ پر ماری اور میرے لئے گالیوں کا فوارہ بھی کسی پولیس والے کے منہ سے پھوٹا۔

میں پولیس والوں کی اس بدسلوکی پہ تلملا کے رہ گیا تھا۔ میں نے کچھ احتجاج بھی کیا لیکن پولیس والے مجھے دھکے دیتے ہوئے، میرا گریبان پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے نیچے لے گئے۔

سڑک پر خوفناک سناٹا تھا۔

رات اچانک اندھیری اور سیاہ ہو گئی تھی۔ روشنی کی کہیں کوئی کرن تک باقی نہ تھی۔ بھاری بوٹوں کی آوازوں کے سوا رات کے سناٹے کو کبھی کبھی الوؤں کے چیخنے

کی آوازیں توڑ رہی تھیں۔

پولیس والوں نے مجھے دھکا دے کر ایک گاڑی میں بٹھا دیا۔ جس وقت مجھے دھکا دیا گیا، میں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر بھی گیا تھا۔

جب میں گرا تو مجھے ایسا لگا کہ میرے گھر میں ٹنگا ہوا پورٹریٹ، جسے میں نے بڑی عقیدت سے اپنے گھر میں لگایا تھا، جو ایک ہاتھ میں لاٹھی پکڑے اور کپڑوں کے نام پر صرف لنگوٹی باندھے ہوئے ایک شخص کی دھندلی سی تصویر تھی، وہ پورٹریٹ آج اپنی جگہ سے کچھ انچ نیچے سرک گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں تھانے کے اندر تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہی ہیڈ کانسٹیبل مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک یوں ہی مسکراتا رہا پھر اس کا چہرہ ایک دم کرخت ہو گیا اور وہ کھردرے لہجے میں مجھ سے بولا۔ ''آؤ جواری، شرابی، رنڈی باز! سالے تم ایسے باز نہیں آؤ گے۔ جب تک تمہاری چمڑی نہ اُدھیڑی جائے......''

میں نے جلدی سے دو سو روپے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف بڑھائے تو اس نے میرا گریبان پکڑ کر گھسیٹ لیا اور کہا۔ ''ابے کمینے! صرف دو سو روپے؟''

میں نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جتنی بھی کرنسی تھی، ساری کی ساری ہیڈ کانسٹیبل کے آگے ڈال دی اور اپنی جیب کو بھی اُلٹ کر دکھا دیا کہ اب یہ خالی ہو چکی ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل نے جلدی جلدی نوٹ گننے شروع کئے۔ میں نے ایک بار پھر اس کی انگلیوں کو غور سے دیکھا۔ بالکل بھئے جیت کی انگلیوں کی طرح تھیں!

لیکن پھر بھی میں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور تھانے سے بھاگ کھڑا ہوا۔

بھاگتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھ بے شمار گندی گلیاں ہیں۔ ان میں غربت ہے۔ بھوک اور افلاس زدہ چہرے ہیں۔ محرومیوں کا اتھاہ ساگر ہے۔ ذلت ہے، بے روزگاری ہے، خوف ہے...... اور ان سب نے مل کر شگفتہ

چہروں کے بھی نقوش بگاڑ دیئے ہیں۔ ایک اکھڑپن ہے۔ جہالت ہے۔ بچوں کی افراط ہے۔ اخلاق کا کہیں نام ونشان نہیں ہے، اور ان سب کا میں ایک حصہ ہوں۔ حالانکہ کبھی میرے یہاں سے ایثار، خلوص، محبت، تہذیب، تمدن، انکسار اور سماج کی اعلیٰ اقدار کے سوتے پھوٹتے تھے۔

ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ شہر کے سب سے بڑے میدان میں ایک جلسہ ہے، جہاں بھئے جیت کمار گوڑ تقریر کرنے والا ہے۔ چونکہ اس سے بہت دِنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس کی تقریر کی خبر سن کر میں بھی میدان کی طرف چل دیا۔

میں نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق بھئے جیت کی تقریر سننے جا رہے ہیں۔ کچھ پروفیسر، دانشور اور صحافی بار بار کہہ رہے تھے کہ اتنا مخلص، بے لوث، عوام کا خادم رہنما اور کوئی نہیں۔ کچھ کوی بھئے جیت کی تعریف میں کویتائیں کہہ کر لے جا رہے تھے، راستے میں پڑنے والے کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کے آگے لگی مارکس کی تصویر بے حد اُداس اور خاموش تھی۔

میں جب میدان میں پہنچا تو بھئے جیت کو دیکھنے اور سننے کے لئے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

بھئے جیت کی زبان سے کبھی پھول برستے تو کبھی شعلے۔ وہ کبھی خلوص و محبت اور ایثار کا پیکر بنتا تو کبھی اس کے تیور انتہائی خوف ناک ہوتے۔

اپنی تقریر کے آخر میں اس نے کہا۔

''بہنو اور بھائیو! اب سمئے ہماری مٹھی میں ہے۔ ہمیں ان پرتیکوں (علامتوں) کو ہٹا دینا ہے جو ہمیں پسند نہیں ہیں، اور نئے پرتیک بنانے ہیں۔ وہ پرتیک جو کہ ہمیں پسند ہیں، جن میں ہماری آستھا (عقیدہ) ہے۔ بھائیو اور بہنو! ایک بات اور۔ ہمارا آکٹوپس اب بہت بلوان ہو گیا ہے، جن بدھی جیویوں (دانشوروں) نے یہ سمجھا کہ ہمارے آکٹوپس کی بھجائیں بہت ہی لج لجی اور نربل ہیں، ان دشٹوں کو یہ وشواس کر لینا چاہئے کہ وہ دن دور نہیں، جب سمست (سارے) دیش کی سیمائیں،

ہمارے آکٹوپس کی کٹھور اور بلوان بھجاؤں کے گھیرے میں ہوں گی۔''

یہ سن کر بھیڑ نے زوردار نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ بھئے جیت کمار کی جے جے کار ہونے لگی۔

اچانک مغرب سے آنے والی ہواؤں کا زور بڑھ گیا اور ان میں ایک زوردار قہقہہ گونجنے لگا۔ ایک خوفناک قہقہہ، جس کی گونج سے میرے کان کے پردے پھٹنے لگے۔

لیکن بھئے جیت بہت محظوظ ہو رہا تھا، وہ بہت خوش تھا۔

اگلے دن میں صبح سویرے ڈبل روٹی لینے جا رہا تھا کہ ایک چوراہے پر بھئے جیت سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے پھر اس سے شکایت کرنا چاہی کہ وہ مجھے پھنسا کر خود غائب ہو جاتا ہے، تو بھئے جیت نے پھر وہی پُرانی بات دہرا دی کہ وہ میری رکشا کرنے کے لئے ہی غائب ہوا تھا اور جب تک وہ میری سہایتا (مدد) کو پہنچتا تب تک میں تھانے سے آچکا تھا۔

اس روز بھی بھئے جیت کے پاس ایک اچھا پروگرام تھا۔ کہنے لگا...... ''بھور کا سمئے ہے۔ آج ایک سندر جگہ سیر کو چلتے ہیں، جہاں 'آکرشک' (دلکش) پھول ہیں، کلیاں ہیں، سگندھ ہے۔ پاون پون بہتی ہے۔ بھنورے گنگناتے ہیں، تتلیاں ناچتی ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ خوشبو ہی خوشبو ہے۔ آؤ چلیں۔''

میں بھئے جیت کمار کی باتوں میں آگیا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ ہم دونوں گپ شپ کرتے ہوئے ایک شاندار باغیچے میں داخل ہوئے، جس کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' باغیچے میں دور دور تک پھولوں سے لدے پودوں کی کیاریاں تھیں۔ گلاب، گیندا، چمپا، چنبیلی، بیلا، گل داؤدی، نرگس، غرض کہ ہر قسم کے پھول اور پودے تھے۔

باغیچے کے ایک کنارے پر تالاب تھا جس میں کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے اور اوس کی بوندیں کنول کے پھولوں کی پتیوں پہ موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

میں اور بھئے جیت کچھ دیر باغیچے میں ٹہلتے رہے۔

اس کے بعد ایک جگہ کھڑے ہو کر ہم نے گلاب کے ایک پھول کو چھوا، اسے سونگھ کر دیکھا۔ بڑی پیاری خوشبو تھی۔

بھئے جیت نے ایک اَدھ کھلی گلاب کی خوبصورت کلی توڑ کر مجھے دی اور کہنے لگا۔ ''دیکھو کتنی سندر کلی ہے۔''

میں نے کلی کو ہاتھ میں لیا۔ لیکن ابھی پوری طرح اس کو دیکھا بھی نہیں تھا کہ پورے باغیچے کی فضا بدل گئی۔ ایک دم ایسا لگنے لگا کہ لُو کے تیز جھکڑ شروع ہو گئے ہوں اور پورے باغیچے پہ عقاب جھپٹے مارنے لگے ہوں۔

سائرن اور بھاری بوٹوں کی آوازوں سے پورا باغیچہ گونجنے لگا۔

میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگا کہ خدا جانے ماجرا کیا ہے؟ یہاں نہ تو جوا خانہ ہے، نہ شراب خانہ، نہ رنڈی خانہ۔ پھر یہ آوازیں کیوں؟

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ساتھ کئی فائر ہوئے اور وہ ساری گولیاں میرے جسم میں لگیں، جس سے میرے جسم کا گوشت اُدھڑ کر باغیچے کے پھولوں کے اوپر جا گرا اور میرے جسم سے بہتا ہوا خون پھولوں کی کیاریوں میں دوڑنے لگا۔

ایک بار پھر وہی منظر تھا۔ بھئے جیت حیرت انگیز طور پر غائب تھا اور پولیس والوں نے مجھے بالکل اس طرح دبوچا ہوا تھا جیسے جنگلی بلا کسی مرغی کو دبوچ لیتا ہے۔

میں نے پولیس والوں کے پنجے میں دبی اپنی گردن کو تھوڑا سا ڈھیلا کرتے ہوئے کہا۔ ''جوانو! میرا کیا قصور ہے؟ میں تو صرف کلی کو سونگھ رہا تھا، اور اگر کوئی قصور بھی تھا تو نہ وارننگ، نہ لاٹھی چارج، نہ آنسو گیس۔ سیدھی گولی، اور وہ بھی سینے میں!''

''خاموش حرام زادے!''

اس کے ساتھ ہی میری پشت پر کئی لاتیں پڑیں اور پولیس والوں نے مجھے گاڑی میں دھکیل دیا۔ دھکا اتنا زوردار تھا کہ میں اوندھے منہ گر پڑا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے گھر میں لٹکا ہوا وہ پورٹریٹ ایک دم کئی انچ نیچے آ گیا ہے جس کو میں نے بہت عقیدت کے ساتھ اپنے گھر کی دیوار پر ٹانگا تھا۔

تھانے میں داخل ہوتے ہی پولیس افسر نے مجھے دیکھا اور میرے منہ پر تھوک دیا، کہنے لگا۔ ''کمینوں! تمہاری اب اتنی ہمت ہوگئی کہ تم کلیوں کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتے، باغیچوں کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتے! انہیں بھی اجاڑ دینا چاہتے ہو، انہیں بھی گندا کر دینا چاہتے ہو! ابے سالو، جب تم جانوروں اور پرندوں کو بے دردی سے کاٹ کے کھا جاتے ہو تو پھولوں کو کیا چھوڑو گے! لے جاؤ اسے، اور اس کے ٹخنوں کی مینگ نکال لو۔''

یہ کہہ کر پولیس آفیسر نے ایسا زوردار تھپڑ میرے منہ پر مارا کہ میرا منہ گھوم گیا اور آنکھوں کے آگے پتنگے ناچنے لگے۔

کچھ لمحوں کے بعد، جب میری آنکھیں دیکھنے کے لائق ہوئیں تو وہی جانے پہچانے ہیڈ کانسٹیبل صاحب سامنے کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ چلو، اب اپنا معاملہ طے ہو جائے گا۔

ہیڈ کانسٹیبل مجھے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔ اس نے آنکھ کا اشارہ کیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے الگ لے جا کر مجھ سے اسی کھردرے لہجے میں کہا۔

''تم نے اس بار بہت ہی سنگین جرم کیا ہے۔ تھوڑے پیسوں میں کام نہ بنے گا۔'' میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ''آپ جو کہیں گے میں آپ کو وہی دوں گا لیکن مجھے تھوڑا سا وقت آپ دے دیں۔ یوں بھی آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں اپنی جیب کی ساری کرنسی آپ کو پہلے ہی دے چکا ہوں، اور اس وقت تو میں گھر سے ڈبل روٹی لینے کے لئے نکلا تھا۔ پھر بھی آپ مجھے ذرا سا وقت دے دیں۔ فصل پک کر تیار ہو گئی ہے۔ میں سارے کا سارا اناج آپ کے پاس بھیج دوں گا۔''

''ٹھیک ہے...... لیکن یاد رکھنا سارا اناج تھانے میں آجانا چاہئے۔ اگر ہمیں معلوم ہوا کہ تم نے ایک دانا بھی اپنے لئے روکا ہے تو تمہاری آنتوں میں ہاتھ ڈال کر نکال لیں گے۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے کہا اور میرا گریبان پکڑ کر تھانے سے باہر کر دیا۔

تھانے سے باہر آتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کیا میں اس سچائی کو قبول کروں گا کہ دھوپ کی شدت سے تپتے ہوئے لق ودق صحراء میں میرے پاؤں ریت میں دھنستے چلے جارہے ہیں، سورج کی تیز شعاعوں سے میرا جسم جھلسا جارہا ہے...... یا اپنے مختصر سے شاندار ماضی میں ہی گم رہوں گا؟

اس درمیان بھئے جیت کمار گوڑ بہت بڑا آدمی بن گیا تھا، اس لئے اس سے میری کئی برس تک ملاقات نہ ہو سکی۔ بس اخبارات سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ بھئے جیت دیس بدیس کے دورے کر رہا ہے۔ اس کی میٹنگوں میں لوگ بہت بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں اور وہ بہت ہی شاندار تقریر کرتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ اپنے آکٹوپس کا ذکر کرتا تھا، جس کے بازو روز بہ روز مضبوط ہو رہے تھے...... یہ اور بات ہے کہ آکٹوپس کے ذکر سے کچھ خاص لوگ ہی خوش ہوتے۔ زیادہ تر لوگوں کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ آکٹوپس اور اس کے مضبوط ہوتے ہوئے بازوؤں سے بھئے جیت کی کیا مراد ہے؟

ایک صبح کو میں حسب معمول چہل قدمی کر رہا تھا۔ یکا یک دیکھا کہ سامنے سے بھئے جیت کمار چلا آرہا ہے۔ یوں اتفاقاً اس سے بہت عرصہ بعد ملاقات ہوئی۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد بھئے جیت بولا۔

''یار! اپنا لگ بھگ پینتالیس سال پُرانا ساتھ ہے۔ جہاں بہت سے کام ہم نے ایک ساتھ کئے ہیں، وہاں ایک کام اور میرے ساتھ کرو......''

''نہیں یار! تو ہمیشہ مجھے چھوڑ کے غائب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس بار میں کسی قیمت پر بھی تیرے ساتھ نہ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

بھئے جیت بولا۔ ''بس ایک بار اور۔ دیکھ، اس بار تجھے چلنا ہی پڑے گا۔''

''اچھا، کام کیا ہے...... یہ بتا؟''

بھئے جیت نے سرگوشی میں کہا۔

''کل کو کامریڈ رام داس کا قتل کرنا ہے، اور یہ قتل کرنا اَتی آوشیک (بہت

ضروری) ہو گیا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو کہتا ہے تو یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ کرنا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں کرنا۔ کل ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے تو مجھے کامریڈ رام داس کے گھر کے باہر ملنا۔"

○○

اگلے دن ....

۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء، بروز اتوار، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے میں کامریڈ رام داس کے گھر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ کامریڈ رام داس ایک بہت پُرانے نیم کے پیڑ کے نیچے تنہا کھڑے خیالوں میں گم تھے کہ اچانک دوسری سمت سے بھئے جیت نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں کدال تھی، جو اس نے پلک جھپکتے ہی نوکیلی طرف سے کامریڈ رام داس کے سر پر ماری۔ کدال اندر تک بیٹھتی چلی گئی اور ایک ہی وار میں کامریڈ کا کام تمام ہو گیا۔ کامریڈ کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔

لیکن اسی وقت سائرنوں کی تیز آوازوں سے پوری فضا گونجنے لگی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا، بھاری بوٹوں اور فائروں کی زد میں، میں اور میرا پورا جسم آچکے تھے۔ کئی گولیاں میرے لگی تھیں اور میرے خون کے چھینٹے گندی گلیوں اور ٹوٹے مکانوں پہ جا لگے تھے۔ ایک رائفل کی بٹ میرے سر پر پڑی تو میرا بھیجا پلپلا ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں مجھے ایسا لگا جیسے میرے گھر میں لگے ہوئے اس آدمی کا پورٹریٹ، جس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور کپڑوں کے نام پر صرف لنگوٹی تھی، وہ پورٹریٹ جسے میں نے بے حد عقیدت سے اپنے گھر میں لگایا تھا، اچانک زمین پر گر پڑا ہے اور چور چور ہو گیا ہے۔

لیکن ایسا ہوا نہیں تھا۔ پورٹریٹ گرا ضرور تھا، لیکن اب اُس ڈوری کے سہارے جھول رہا تھا جو کیل اور پورٹریٹ کے بیچ میں تھی۔

پینتالیس سال پُرانی، بوسیدہ ڈوری میں ابھی اتنی قوت باقی تھی کہ اس نے پورٹریٹ کو زمین پر گرنے اور چور چور ہونے سے بچالیا تھا............

جب میری آنکھ کھلی تو میں تھانے میں تھا۔

چند پولیس والے مجھے اپنے گھیرے میں لئے کھڑے تھے۔ انہوں نے پولیس کے ایک بڑے آفیسر کے سامنے مجھے پیش کیا۔

''سر! یہ ایک خطرناک مجرم ہے۔ اس نے نہ صرف کامریڈ رام داس کا قتل کیا ہے بلکہ پولیس پر حملہ بھی کیا ہے۔'' ایک سپاہی نے کہا۔

پولیس کا بڑا آفیسر بولا۔ ''ہمیں معلوم ہے کہ یہ ایک خطرناک مجرم ہے۔ لہٰذا اس کی ضمانت یہاں سے نہ دی جائے، بلکہ اس کو ڈسٹرکٹ جج کے سامنے پیش کیا جائے اور وہیں سے اس کی ضمانت ہونی چاہئے۔''

پولیس آفیسر کی آواز سن کر میں ششدر رہ گیا کہ یہ آواز بالکل بھئے جیت کمار گوڑ کی آواز کی طرح تھی۔

اگلے دن مجھے ڈسٹرکٹ جج کے سامنے پیش کیا گیا۔

جج کو بتایا گیا کہ یہ ایک خطرناک مجرم ہے۔ ڈسٹرکٹ جج نے اپنے چشمے کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں خبر ہے کہ یہ ایک خطرناک مجرم ہے۔ لہٰذا اس کی ضمانت ہائی کورٹ دے سکتا ہے، ہم نہیں۔''

ڈسٹرکٹ جج کی آواز سن کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ یہ آواز بھی بھئے جیت کی آواز کی طرح تھی۔

پھر مجھے ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا اور ہائی کورٹ کے جج کو بھی یہی بتایا گیا کہ یہ ایک خطرناک مجرم ہے۔ ہائی کورٹ کے جج نے بہت ہی عالمانہ انداز میں کہا۔ ''ہمیں علم ہے کہ یہ ایک خطرناک مجرم ہے۔ اس کی ضمانت صرف سپریم کورٹ ہی دے سکتا ہے۔''

ہائی کورٹ کے جج کی آواز سن کر میرا سر چکرا گیا کہ یہ آواز بھی بالکل بھئے جیت

کی آواز کی طرح تھی۔

سپریم کورٹ کی عمارت قدیم پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ پتھروں پر قدیم آرٹ کے نمونے بھی نمایاں تھے۔

مجھے ایک بہت بڑے ہال میں لے جایا گیا جہاں ایک طرف مجرموں کے لئے بنے ہوئے کٹھرے تھے، وہاں ایک کٹھرے میں مجھے کھڑا کر دیا گیا۔

ہال کے اندر بہت سے آفیسرز تھے، جو حسب مراتب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

اگلی صف میں سفید کُرتے پائجامے میں ملبوس یا سفید براق دھوتی باندھے کچھ بہت شریف لوگ بیٹھے تھے، جن کے چہرے انتہائی معصوم اور بھولے بھالے تھے۔ ان بھولے بھالے سجن پُرشوں کے گلے میں بہترین اداکار ہونے کے تمغے پڑے ہوئے تھے۔ ہال کو چاروں طرف سے مخصوص پلٹن نے گھیر رکھا تھا۔

چند لمحوں کے بعد جج صاحب کے آنے کی اطلاع ہال میں موجود لوگوں کو دی گئی تو سب کے سب جج صاحب کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے اور سب کے چہروں پر چمک آ گئی۔

جج صاحب ایک خاص انداز سے چلتے ہوئے سب سے اوپر رکھی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی ہال میں موجود لوگ بھی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

اس بیچ میں نے کئی بار اپنی آنکھیں مل کر سپریم کورٹ کے جج کی سب سے اونچی کرسی پر بیٹھنے والے شخص کو دیکھا۔ وہ بھئے جیت کمار گوڑ تھا۔ اسے دیکھ کر پہلے تو مجھے حیرت ہوئی، پھر ایک دم میں خوش ہو گیا کہ چلو اب سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

اچانک عدالت کے باہر دور کہیں گھنٹے بجنے کی آواز سنائی دی اور پھر آہستہ آہستہ یہ شور بڑھتا ہی چلا گیا۔ جب گھنٹوں کی آواز کم ہوئی تو بھئے جیت کمار گوڑ کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے میری طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"تمہارا کیس نچلی عدالتوں کے پاس تھا اور جو فیصلہ نچلی عدالتوں نے دیا

ہے، میں اس سے سو فیصد اتفاق رکھتا ہوں۔ تم پر الزام ہے کہ تمہاری مانسکتا گھاتک (ذہنیت خطرناک) ہے۔ تم شدھ مانساہاری (گوشت خور) ہو اور تمہارے پوروج (آباو اجداد) لٹیرے تھے اور تم بھی اسی مانسکتا سے گرست ہو۔ تم نے یہاں کی سنسکرتی کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا ہے، یہاں کی تہذیب، تمدن اور سارے کلچر کو غارت کر دیا ہے، اس لئے تمہارے واسطے سخت سے سخت سزا تجویز کی گئی ہے۔"

"می لارڈ! یہ سچ نہیں ہے، یہ فیصلہ ایک طرفہ ہے۔ یہ ادھوری سچائی ہے۔" کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے جج سے کہا (جس نے کھادی کی قمیص اور کھادی کی پتلون پہنی ہوئی تھی) تو پورے ہال میں خوفناک سناٹا چھا گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد بھئے جیت کمار کی آواز ابھری۔

"دراصل یہاں کی سنسکرتی کو اتنا نقصان باہر والوں سے نہیں ہوا جتنا یہاں کے اپنوں سے۔ اس لئے عدالت تمہیں سزائے موت دیتی ہے۔"

یہ کہہ کر بھئے جیت نے مخصوص پلٹن کے رضا کاروں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "عدالت کے آدیش کا پالن کیا جائے، اور اس مورکھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چوراہوں پر ٹنگوا دیئے جائیں، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ عدالت کے آدیش کو غلط کہنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

یہ سنتے ہی مخصوص پلٹن کے کارکنوں نے اس شخص کو دبوچ لیا۔

"یہ انیائے ہے!" اگلی صف میں بیٹھا ایک شخص، جو کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے تھا، تقریباً چیخنے کے انداز میں بولا۔ "یہ انیائے ہے جج صاحب، یہ انیائے ہے! عدالت ایسا نہیں کر سکتی۔"

بھئے جیت نے یہ سن کر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"آپ نے جو کچھ بھی کہا، عدالت کو اس پر ذرا بھی اچنبھا نہیں ہوا۔ عدالت کو آشا تھی کہ آپ ایسا ہی کہیں گے۔ اس لئے عدالت حکم دیتی ہے کہ ان محترم بزرگ کو بھی گرفتار کر لیا جائے اور ایک کمرے میں بند کر کے انہیں دھیرے دھیرے اثر

کرنے والا زہر دیا جائے۔ سماچار پتروں کو یہ سماچار دیا جائے کہ یہ بزرگ کینسر کی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں، ان کو علاج کے لئے بدیس بھیجا گیا ہے اور ان کی سرکشا کے کارن یہ بات گپت رکھی گئی ہے کہ وہ بدیس میں کہاں ہیں۔ جب مہینے دو مہینے کے بعد ان کا دیہانت ہو جائے تو ایک گپت ہوائی جہاز کے ذریعہ ان کا شو (لاش) ہوائی اڈے پر اُتارا جائے اور پورے راجکیہ سمّان (سرکاری اعزاز) کے ساتھ ان کی شو یاترا نکالی جائے اور پندرہ دن کا راجکیہ شوک منایا جائے۔"

یہ حکم دے کر بھئیے جیت کمار نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "تم نے دیکھا، عدالتوں نے تمہیں خطرناک مجرم مانا ہے اور انہوں نے ٹھیک ہی مانا ہے۔ یہ عدالت تمہیں حکم دیتی ہے کہ آج کے بعد تم اصطبل کی صفائی کیا کرو گے، گھوڑوں اور خچروں کی لید اُٹھایا کرو گے اور انہیں دانا اور اچھی گھاس کھلایا کرو گے، فوجیوں کو ادب کے ساتھ گھوڑوں پر بیٹھایا کرو گے...... بس، اب عدالت برخواست کی جاتی ہے۔"

عدالت کا حکم ملتے ہی مخصوص پلٹن کے کارندوں نے مجھے پکڑ لیا اور اصطبل کی طرف لے جانے لگے۔ مخصوص پلٹن کے کارندوں کے نرغے میں پھنسا ہوا میں سوچتا ہوں کہ کیا میں اس سچائی کو قبول کروں گا کہ تپتے ہوئے لق و دق صحرا میں میرے پاؤں دھنستے چلے جا رہے ہیں یا صرف اپنے مختصر سے شاندار ماضی میں ہی گم رہوں گا؟ OO

گئو ہتھیا بند کرو

ڈھیلہ ندی کے کنارے بسا ہوا آدم پور گاؤں، صنعتی ترقی اور ذرائع ابلاغ سے بے نیاز تھا۔ پورا گاؤں چودھری مجید خاں اور گاؤں پردھان برکت علی کی مرضی سے سانسیں لیتا تھا...... برسات گاؤں میں ہریالی بکھیر کر رخصت ہوئی اور گلابی جاڑوں کی آمد آمد ہوئی تو ایک صبح چودھری مجید خاں نے فجر کی نماز ادا کی اور تسبیح پڑھے بغیر ہی عزیز قصائی کے گھر کی طرف چل دیئے۔ عزیز قصائی منہ اندھیرے ہی گائے ذبح کر چکا تھا۔ اس کی کھال بھی اُتار چکا تھا۔ اب جلدی جلدی اس کے ٹکڑے کرنے میں مصروف تھا...... دن نکلتے ہی وہ گوشت کو ٹھکانے لگا دینا چاہتا تھا۔ مجید خاں کی آہٹ پر اس نے گردن اوپر اٹھا کر دیکھا۔ خاں صاحب کو گھر آیا دیکھ کر اس کا ہاتھ بے اختیار سلام کے لئے اُٹھ گیا۔

''سلام سرکار۔''

''سلام......''

عزیز نے جلدی سے اپنی بیوی کو آواز دی۔

''اری کٹھیا لا اُٹھا کے جلدی سے۔ بڑے سرکار آئے ہیں۔''

عزیز کی بیوی نے چارپائی لاکر ڈال دی اور حقہ بھرنے چلی گئی۔ مجید خاں چارپائی پر چوڑے ہو کر بیٹھ گئے اور عزیز سے کہنے لگے۔

''ابے عزِ زوے، میں سویرے ہی اس لئے آیا ہوں کہ آج میری بیٹی

کی سسرال سے کچھ مہمان آرہے ہیں۔ دھڑی بھر گوشت ڈکری والا، کھیری اور تھوڑا قیمہ بھیج دے۔''

اس بیچ عزیز کی بیوی تو کسی کام میں لگ گئی، اس کی جوان بیٹی حقہ بھر کے لے آئی...... مجید خاں نے عزیز کی بیٹی کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ لڑکی نے جلدی سے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا اور شرماتی ہوئی اندر چلی گئی۔ مجید خاں کہنے لگے۔

''ابے عزوے...... لونڈیا تیری بھی سیانی ہوگئی بھئی۔''

''ہاں سرکار، اسی کا تو مرن ہے۔ اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں سرکار۔ رشتہ بھی لگ گیا ہے۔ اب کے بیساکھ میں کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ آپ سے تھوڑی سی مدد چاہتا ہوں۔ دھڑی دو دھڑی گوشت کی تو کوئی بات نہیں سرکار، لیکن پچھلے کئی مہینوں سے چودھرائن نے نہ تو گیہوں ہی دیئے ہیں اور نہ ہی پیسے۔ جب بھی میں گیا یا گھر والی گئی تو یہ کہہ کے انہوں نے ٹرخا دیا کہ پیسے چودھری صاحب سے لینا...... آپ سے کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی سرکار...... آج بات آگئی تو اتنی ہمت بھی ہوگئی حضور۔ میں گوشت کے پیسوں کو نہیں کہہ رہا۔ میں تو بس آپ کی مدد چاہتا ہوں کہ بیٹی کو آسانی سے رخصت کرسکوں۔''

''بات تو تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ پیسے تو تجھے ملنے ہی چاہئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بات تو اور بھی سمجھ لے۔ ہمارے گھر آئے دن تھانے سے پولیس والے آتے رہتے ہیں۔ دارو پی کر انڈے مرغ کھاتے ہیں اور لمبی ڈکار لیتے ہوئے کہتے ہیں...... ''بھئی چودھری، کوئی کام وام بتاؤ یار۔ کیا تمہارے یہاں سب امن چین ہے؟'' تو میں کہہ دیتا ہوں کہ حضور آپ کی مہربانی ہے۔ اب تو دیکھ لے، تو اگر کہے تو وہ پیسے تجھے دے دیا کریں گے جو پولیس والوں پر خرچ کرتے ہیں۔''

''نہیں سرکار یہ بات نہیں ہے۔ میں تو آپ کا ہاتھ سر پر ہونے کی وجہ سے گائے کاٹ لیتا ہوں ورنہ میری اتنی ہمت کہاں سرکار کہ میں یہ غیر قانونی کام کروں۔ میں تو بس آپ کی مدد چاہتا ہوں۔''

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں، گوشت بھجوا دیے۔"

"اچھا سرکار...... سلام سرکار۔"

"سلام۔"

عزیز قصائی، چودھری مجید کو جاتے دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ عزیز جیسے مشاق قصائی کا ہاتھ غلط ڈھنگ سے گائے کی ہڈی پر پڑا اور اس کے ہاتھ میں دبا ہوا لوہے کا پھل تِرک کر اس کی ٹانگ کی طرف آیا۔ اگر تیزی سے اس نے اپنی ٹانگ اوپر نہ اُٹھائی ہوتی تو اس کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوتی۔

عزیز نے ابھی گوشت کی بوٹیاں بھی بنانی شروع نہ کی تھیں کہ گاؤں پردھان برکت علی کا نوکر آ گیا اور کہنے لگا۔ "عزیز...... چھوٹے سرکار نے کہلوایا ہے کہ گاؤں کی ترقی کے لئے شہر سے کچھ بابو لوگ آ رہے ہیں۔ دوپہر کو کھانا کھائیں گے۔ یہ کپڑا لے...... گوشت اور کلیجی گردے بھیج دے...... فوراً۔ پائے چاہے بعد میں بھیج دینا اور تجھے اگر فرصت نہ ہو تو گھر والی کے ہاتھ بھجوا دیے۔"

"ہاں ہاں بھجوا دوں گا...... تو ایک بات بتا۔"

"ایک کیا دو پوچھ۔"

"تو بھی غریب ہے اور میں بھی۔ تو میری وِپتا آسانی سے سمجھ سکے ہے۔ میری بیٹی سیانی ہو گئی ہے۔ اس کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔ چھوٹے سرکار سے کہہ کر کچھ پیسے دلوا دے۔ تیرا بڑا احسان ہو گا۔"

"دیکھ بھئی...... جب تک تو گائے کاٹے گا، تجھے پیسے نہیں ملیں گے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ پیسے ملیں تو گائے کاٹنا بند کر دے۔"

"کیا بتاؤں یار، میرا بھی دل نہیں چاہتا گائے کاٹنے کو، لیکن ہے کیا کہ جب گائے دودھ دینا بند کر دیتی ہے اور اس کی بیائت بھی بند ہو جاتی ہے، تب یہ کسی کام کی نہیں رہتی، اب اسے چارا کون ڈالے؟ کون کرے اس کی خدمت؟ لہٰذا یہ سوکھ کر ڈنگر ہو جاتی ہے اور ہمیں سستے داموں میں مل جاتی ہے۔ کچھ اوسط آ جاتا ہے اس میں۔"

’’تجھے اوسط آجاتا ہے نا...... چھوٹے سرکار اور بڑے سرکار کو پیسے دینے میں اوسط نہیں آتا۔‘‘

’’یار دوسرا کوئی کام دھندا بھی نہیں آتا مجھے۔ باپ دادا نے سکھایا ہی یہی تھا۔‘‘

’’چھوٹے سرکار اور بڑے سرکار کے باپ دادا نے بھی انہیں کچھ سکھایا ہوگا۔ بس اب میں جاؤں۔‘‘

گاؤں پردھان برکت علی کا نوکر چلا گیا اور عزیز اس کا بھی منہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے جلدی جلدی کلیجی، گردے بنائے، تھوڑا گوشت بنایا اور کپڑے میں باندھ کر اپنی بیوی کو آواز دی۔

’’اری لے...... یہ چھوٹے سرکار کے یہاں دے آ۔‘‘

عزیز کی بیوی نے گوشت کی پوٹلی سنبھالی اور جاتے ہوئے اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لے لیا۔

جیسے ہی یہ دونوں ماں بیٹی برکت علی کے دروازے میں داخل ہوئیں تو برکت علی کہیں جانے کے لئے گھر سے باہر آرہے تھے۔ انہیں دیکھ کر عزیز کی بیوی نے دوپٹے کے پلو سے اپنا سر اور چہرہ ڈھکا اور ’’سلام سرکار‘‘ کہتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی بیٹی بھی داخل ہوئی۔ برکت علی نے عزیز کی بیٹی کو غور سے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے اور باہر جاتے جاتے اندر لوٹ آئے۔ عزیز کی بیٹی کے تیکھے نقوش ان کے دماغ میں پیوست ہو گئے، جو کہ دل کی باریک رگوں میں سے ہوتے ہوئے جسم میں لذت آمیز گدگدی پیدا کرنے لگے۔ عزیز کی بیوی نے جب برکت علی کی یہ حالت دیکھی تو جلدی سے بولی۔

’’گوشت سرکار۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے گوشت کی پوٹلی چارپائی پر رکھی، اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل گئی۔ برکت علی کچھ دیر تک یوں ہی کھڑے رہے۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنی چوپال پر آئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔

دن بھر برکت علی نے ذہنی مشقت کی پھر بھی وہ کوئی ایسا نکتہ تلاش نہ کر سکے جس سے کہ عزیز کی بیٹی ان کے چنگل میں پھنس جائے۔ رات جب گہری ہوئی تو انہیں چودھری مجید خاں کا خاص آدمی آتا دکھائی دیا۔ یوں تو برکت علی اور مجید خاں کے بیچ پشتینی دشمنی تھی لیکن کچھ معاملات میں ان لوگوں میں بلا کا اتفاق تھا۔ مجید خاں کے آدمی نے برکت علی کو ادب سے سلام کیا اور ایک رقعہ ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ ''یہ بڑے سرکار نے بھجوایا ہے۔'' یہ کہہ کر پھر اس نے ادب سے سلام کیا اور چلا گیا۔ برکت علی نے کاغذ کھولا اور تحریر پڑھنا شروع کی۔ ''ہماری دشمنی اپنی جگہ...... لیکن گاؤں کے باغی ہوتے لوگوں کو روکنا ہمارا فرض بھی ہے اور ضرورت بھی۔ آج کل عزیز قصائی کے پَر نکل آئے ہیں۔ اس کا دماغ ٹھیک کرو۔ سنا ہے کہ کل وہ پاس والے قصبے میں گائیں خریدنے جائیے گا۔ تم تھانے جا کر سپاہیوں کو اطلاع کر دو کہ عزیز جیسے ہی گایوں کے ساتھ سڑک سے کچے میں اترے، اسے داب لیں۔ باقی کام ہم خود کریں گے۔'' رقعہ پڑھ کر برکت علی کی باچھیں کھل گئیں۔ چودھری کے دماغ کی انہوں نے داد دی کہ کیا دور کی کوڑی لایا ہے چودھری بھی۔ برکت علی دل ہی دل میں خوش ہوئے اور حسین خوابوں و خیالوں کی ان کے دماغ میں رم جھم رم جھم ہونے لگی۔

فجر کی اذان کی آواز پر برکت علی ہڑبڑا کر اُٹھے، نوکر کو بیل تانگہ تیار رکھنے کی ہدایت دے کر نماز پڑھنے چلے گئے۔ سلام پھیر کر انہوں نے مجید خاں کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر ایک لمحہ کے لئے بامعنی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور غائب ہوگئی۔ مسجد سے نکل کر برکت علی تیار کھڑے تانگے پر بیٹھ گئے اور نوکر کے ہاتھوں سے بیلوں کی رسّیاں لیتے ہوئے بولے۔

''میں یوں ہی ہوا خوری کے لئے کھیتوں پر جا رہا ہوں۔ جلدی واپس آجاؤں گا۔ تیری ضرورت نہیں ہے، تو یہیں پر کام دیکھ۔'' یہ کہہ کر برکت علی نے تھانے کی طرف اپنا تانگہ روانہ کر دیا۔ اِدھر عزیز قصائی نے بھی منہ اندھیرے گاؤں کا سوانہ

چھوڑ دیا۔ آدم پور گاؤں سے قصبے کا فاصلہ تقریباً چھ سات کلومیٹر تھا۔ عزیز کو یقین تھا کہ وہ سورج نکلنے تک قصبے میں پہنچ جائے گا اور دوپہر تک گائیں لے کر واپس آجائے گا۔

برکت علی نے تھانے کے باہر کھڑے نیم کے پیڑ کے نیچے تانگہ روکا، بیلوں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور ٹہلتے ہوئے تھانے کی عمارت میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر ایک سپاہی نے نمستے کی۔

''نمستے پردھان جی۔''

''نمستے کمل سنگھ نمستے۔''

''آج تھانے کیسے پدھارے پردھان جی، سب کشل تو ہے؟''

''ارے بھئی کمل سنگھ...... تھانے آئے ہیں تو سمجھو کوئی کام وام تو ہوگا ہی۔''

''ہاں تو بولو کیا کام ہے؟ آخر ہم کس دن کام آئیں گے۔''

''بات یہ ہے کمل سنگھ، آج ہمارے گاؤں کا عزیز قصائی پاس والے قصبے میں گائیں خریدنے گیا ہے۔ امید ہے کہ دوپہر تک لوٹے گا۔ تم یہ کرنا کہ جیسے ہی وہ پکی سڑک چھوڑ کر گاؤں کو آنے والی کچی لیک میں اترے، اُسے وہیں دبوچ لینا، رات کو تھوڑی سی ٹھکائی کر کے اور تھانے دار صاحب سے کہہ کے سویرے ہی اس کا چالان شہر کو کرا دینا۔''

''کیا بات پردھان جی...... اس بار اتنا لمبا کیس کیوں؟'' یہ کہہ کر کمل سنگھ معنی خیز انداز میں ہنسا اور برکت علی کو دیکھنے لگا۔ برکت علی نے جلدی سے سو سو کے کچھ نوٹ نکالے اور سپاہی کو پکڑاتے ہوئے بولے۔

''ایک سپاہی اپنے ساتھ اور لے لینا۔''

''آپ چنتا مت کرو پردھان جی۔ سمجھو آپ کا کام ہو گیا۔''

برکت علی تھانے سے باہر آئے، اپنے تانگے پر سوار ہوئے اور گاؤں کی طرف چل دیئے...... ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ عزیز قصائی کا جھونپڑا بھی

ان کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ مستی میں چور بیلوں کو ہانکے چلے جا رہے تھے۔

قصبے سے گائیں لے کر عزیز واپس ہوا تو اس کا بوسیدہ لباس سرد ہوا کے جھونکوں کو روکنے سے قاصر تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تیر کی طرح اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ مرا مرا سا سورج دوپہر میں شام کا گمان ہوتا تھا۔ عزیز کو شدید بھوک لگ رہی تھی۔ روٹیاں تو وہ اپنے ساتھ باندھ کر لایا تھا لیکن اسے کھانے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔ تین مرئل گایوں کی رسّیاں پکڑے عزیز نے پکی سڑک سے اُتر کر گاؤں جانے والی کچی لیک میں لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیئے۔ وہ ابھی کچھ ہی دور چلا تھا کہ برگد کے پیڑ کی آڑ سے دو سپاہی نکلے اور عزیز کو دبوچ لیا۔ جب تک عزیز کچھ سوچتا، سمجھتا، تب تک دونوں سپاہیوں نے اس کے ہاتھ پیچھے کو باندھ دیئے اور تین چار کس کے لاتیں ماریں۔ عزیز اوندھے منہ گر گیا اور درد سے کراہنے لگا۔ ایک سپاہی نے گایوں کی رسّیاں پکڑیں اور دوسرے نے گالیاں بکتے ہوئے گرے ہوئے عزیز کے ایک ٹھوکر ماری اور بولا۔

''چل بے چل قصابڑے، تھانے چل، تیری ماں کو .... وہاں چل کے تیرا صحیح علاج کریں گے۔''

اگلے دن برکت علی نے نوکر کو بھیج کر عزیز کی بیوی کو بلوایا...... گھبرائی سی عزیز کی بیوی نے آکر برکت علی کو سلام کیا۔ برکت علی اسے چوپال کے پاس بنی ہوئی ایک کوٹھری میں لے گئے اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

''اری تجھے کچھ پتا ہے کہ تیرا میاں کہاں ہے؟''

''کچھ پتا نہیں سرکار...... میرا دل ہول رہا ہے...... کل کے گئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک نہیں آئے۔''

''جیل میں ہے جیل میں...... وہ بھی شہر کی جیل میں۔''

''یہ کیسے ہوا سرکار!!!''

''کچھ نہیں، کوئی گھبرانے والی بات نہیں ہے۔ ہوا یہ کہ وہ کل گائیں لے کر

آرہا تھا۔ راستے میں اسے پولیس نے پکڑ لیا۔ مجھے رات ہی خبر مل گئی تھی۔ میں نے صبح ہی چوکیدار کو تھانے دوڑایا کہ یہیں لے دے کر معاملہ رفع دفع کر لیں گے۔ لیکن چوکیدار نے بتایا کہ اوپر سے کڑے آرڈر آئے ہوئے ہیں۔ اس لئے صبح ہی اس کا چالان کر دیا گیا۔ اب تو پریشان مت ہو، میں دو چار دن میں ہی کوئی وکیل کر کے اس کی ضمانت کرا لوں گا۔ میں سب بندوبست کر دوں گا اور تیری بیٹی کا بیاہ بھی وقت پر ہو جائے گا۔ جتنا پیسہ لگے گا، میں لگا دوں گا۔ تو کسی بات کی فکر مت کر۔ تو سمجھ رہی ہے نا میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''جی سرکار۔'' پتھر بنی عزیز کی بیوی نے ایسے جواب دیا جیسے قبر میں سے بولی ہو۔

''رات کو آؤں گا تیرے گھر...... عشاء کی نماز کے بعد...... آج کل ٹھنڈ بہت پڑ رہی ہے۔ اپنی بیٹی کو سمجھا دیئے میری ڈٹ کر سیوا کرے۔ سیوا ہی میں میوا ہے۔ سمجھ گئی نا...... اس سے کہہ دیجئے زیادہ آنا کانی نہ کرے ورنہ ساری زندگی اس کا باپ جیل میں سڑے گا۔''

عزیز کی بیوی کو گاؤں پردھان کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی لگ رہی تھی...... اس کی سمجھ میں کچھ آرہا تھا اور کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ برکت علی کے یہاں سے اُٹھی اور سیدھی مجید خاں کے یہاں پہنچی۔ مجید خاں اپنے کبوتروں کو دانا ڈال رہے تھے۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی کہا۔

''سرکار...... ان کو پولیس لے گئی......''

مجید خاں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور سمجھ گئے کہ پولیس کسے لے گئی ہے۔

''پولیس لے گئی تو میں کیا کروں؟ پیسے خرچ ہوں گے، شہر جانا ہوگا، وکیل کرنا ہوگا۔ تیرے پاس پیسے ہوں تو میں کچھ سوچوں بھی، کچھ کروں بھی۔ ویسے تو تو سمجھدار ہے۔ تیری جوانی تو عزیزوے کے ساتھ قیمہ کوٹتے کوٹتے گھل گئی۔ لیکن تیری لونڈیا بڑی رسیلی ہو رہی ہے، ایک آدھ چسکی لگوا دے اس میں، ساری زندگی کے لئے نہال کر دوں گا...... عیش کرے گی عیش......'' یہ کہہ کے مجید خاں اسے غور

سے دیکھنے لگے۔ لیکن وہ پتھر کی مورت بنی بے حس و حرکت تھی۔ اس کے چہرے پہ سناٹے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر مجید خاں پھر بولے۔

"اب تو ایسا کر اپنے گھر جا...... پیسوں کا بندوبست کر، اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو گھر منڈیا بیچ، برتن بھانڈے بیچ...... ہو جائے گی ضمانت۔" یہ کہہ کر مجید خاں اپنے کبوتروں میں مصروف ہو گئے۔ عزیز کی بیوی نے بڑے سرکار کی اونچی حویلی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور چپ چاپ وہاں سے واپس آ گئی......

تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، بادل گڑگڑا رہے تھے، بجلی چمک رہی تھی...... مہاوٹیں برسنے کو تیار تھیں۔

پورا گاؤں گھپ اندھیرے اور گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا...... دور کہیں گیدڑوں کے بولنے اور بلیوں کے رونے کی آوازوں میں اُلو کی آواز شامل ہو کر پوری فضا کو آسیبی بنا رہی تھی۔ برکت علی عشاء کی نماز پڑھ کر بہت دیر سے تسبیح گھما رہے تھے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ سارے نمازی جا چکے ہیں اور گاؤں کے لوگ بھی اس سرد رات میں لحاف اوڑھ کر سو چکے ہوں گے...... تب وہ مسجد سے باہر آئے، اِدھر اُدھر نظر دوڑائی...... مکمل تاریکی میں انہیں اپنے قدموں کی آواز بھی بُری لگ رہی تھی۔ لہٰذا وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے عزیز قصائی کے گھر پہنچ گئے۔ قدموں کی آہٹ پر عزیز قصائی کی بیوی اپنے صحن میں آ گئی اور زور سے بولی۔

"کون......؟"

برکت علی نے آہستہ سے جواب دیا۔ "میں......" یہ کہہ کر برکت علی اندر آ گئے اور صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"آپ اس وقت کیوں آئے ہیں؟" عزیز کی بیوی نے پوچھا تو برکت علی کہنے لگے۔

"کیوں آیا ہوں تجھے معلوم نہیں۔ اری عزیز کی ضمانت کرانے آیا ہوں۔ جا، ذرا حقہ بھر کے لا اور اپنی بیٹی سے کہہ کہ آ کے میرے پیر دبائے۔"

''آپ چلے جاؤ......''

''چلا جاؤں گا لیکن یہ تو بتا کہ وہ ہے کہاں؟''

یہ کہہ کر برکت علی چارپائی سے اُٹھے اور جھونپڑے کے اندر جانے لگے تو عزیز کی بیوی نے دوڑ کر جھونپڑے کے دروازے پر اپنے دونوں ہاتھ اَڑا دیئے۔ وہ سینہ تان کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔

''برکت علی تم واپس چلے جاؤ۔ ورنہ میں شور مچاؤں گی اور اگر میرے شور مچانے سے بھی یہ گاؤں نہ جاگا تو میں اس جھونپڑے میں آگ لگا دوں گی...... تمہارے لئے اچھا یہی ہے کہ جس اندھیرے میں سے آئے ہو، اسی اندھیرے میں واپس چلے جاؤ'' برکت علی کو لگا کہ عزیز قصائی کے جھونپڑے میں اس کی بیوی نہیں بلکہ کوئی ناگن پھنکار رہی ہے۔ لیکن وہ گاؤں کے پردھان تھے۔ اس لئے پردھانی کی کچھ نہ کچھ تو انہیں لاج رکھنی ہی تھی۔ وہ تیزی سے عزیز کی بیوی کی طرف بڑھے اور اس کی دونوں چھاتیاں پکڑ کے آم کے پیڑ کی طرح ہلا دیں۔ اسے دو تین جھونٹے دے کر برکت علی گالیاں بکتے ہوئے اپنے گھر کو چل دیئے۔ ٹھیک اسی وقت آسمان سے ٹوٹ کر بجلی گری اور ایک لمحہ کو پورا گاؤں روشنی میں نہا گیا۔ اس کے بعد بجلی تڑتڑاتی ہوئی بادلوں میں واپس چلی گئی۔

عزیز کی بیوی کو جب یقین ہوگیا کہ برکت علی جا چکے ہیں تو اس کے اندر سے خوشی کے آنسو اُمنڈ پڑے۔ وہ سوچنے لگی کہ اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ اس نے برکت علی کا مقابلہ کرلیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر وہ برکت علی کا مقابلہ کرسکتی ہے تو شہر جا کر اپنے شوہر کی ضمانت بھی کرا سکتی ہے۔

دوسرے دن اس نے اپنے کسی رشتہ دار کو اپنے ساتھ لیا اور شہر چلی گئی۔ سارے دن کچہری میں دھکے کھانے کے بعد وہ عزیز کی ضمانت کرانے میں کامیاب ہوگئی۔ رات ان لوگوں نے شہر کے مسافر خانہ میں بسر کی اور گاؤں میں جو کچھ بیتا عزیز کی بیوی اور اس کی بیٹی پر گزری تھی وہ اس نے مختصر الفاظ میں عزیز کو

سنائی۔ عزیز خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا اور خلا میں گھورتا رہا۔ صبح کو سویرے ہی اُٹھ کر میاں بیوی اور ان کا رشتہ دار گاؤں جانے والی بس کے اڈے پر آ گئے۔ عزیز کی بیوی بغل میں پوٹلی دبائے سکڑی سمٹی بس کے انتظار میں عزیز سے لگی بیٹھی تھی کہ ان کے پاس سے چند لوگوں کا ایک جلوس گزرا جو نعرے لگا رہا تھا...... ''گؤ ہتھیا بند کرو...... بند کرو......''

یہ نعرہ سن کر عزیز کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی اور آنکھوں میں خاص قسم کی چمک...... وہ شدت جذبات سے اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ ساتھ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے مضبوطی سے عزیز کا کندھا پکڑ لیا۔

''گؤ ہتھیا بند کرو...... بند کرو......'' کی آوازیں عزیز کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ OO

کہانی کی آمد

نئے شکاری کی چھاگل پانی سے لبالب بھری تھی...... اس کا گھوڑا قیمتی ساز سے سجا ہوا تازہ دم اور تندرست تھا۔ پُرانے تجربہ کار شکاری اپنے اپنے ریشم کے جال لئے اس کے پیچھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلسکوپ رائفل تھی۔ رائفل کی نال اس خرگوش کی جانب اٹھی ہوئی تھی، جو کچھ دیر پہلے جنگل سے نکل کر تپتے ہوئے ریگستان میں داخل ہوا تھا اور اب کہیں ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں گم ہو گیا تھا......

خرگوش کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس تپتے ہوئے لق و دق صحرا کو عبور کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور ریگستان کے اس پار بہہ رہے شیریں چشموں تک پہنچ جائے گا...... جبکہ شکاریوں کا خیال تھا کہ وہ جس طرح جنگل کا محاصرہ کر کے خرگوش کو تپتے ہوئے ریگستان میں لے آئے ہیں، اسی طرح وہ ریگستان میں خرگوش کا گھیراؤ کر کے یا تو اسے مار دیں گے یا تپتی ہوئی ریت پر تڑپ تڑپ کر مرنے کے لئے مجبور کر دیں گے...... پھر ان کو فکر بھی کسی بات کی نہ تھی، کیوں کہ ان کی چھاگلیں پانی سے لبالب بھری تھیں اور ان کے سر پر رنگ برنگے شاندار کپڑوں کی بڑی بڑی چھتریاں تھیں جن کو چاروں سمتوں سے ان کے غلام اٹھائے ہوئے تھے۔ چھتریوں کا کپڑا اتنا دبیز اور چمکدار تھا کہ سورج کی تیز شعاعیں اس کو پار کر کے ان کے سفاک بھیجوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

خرگوش تپتے ہوئے ریگستان میں قلانچیں بھر رہا تھا کہ شیریں چشمے اس کی منزل

تھے اور نئے شکاری کی ٹیلسکو پک رائفل اس کو اپنی زد میں لینے کے لئے بے چین تھی۔

کہانی ایک بار پھر شکاری، خرگوش اور ریگستان میں پہنچ کر ٹھہر گئی۔ مندرجہ بالا سطروں کو وہ کئی مہینوں سے لکھ رہا تھا...... لکھتا اور پھاڑ دیتا...... لکھتا اور پھاڑ دیتا...... وہ بے چین تھا، پریشان تھا۔ اس کے ذہن میں بہت کچھ تھا، لیکن یہاں تک آتے آتے سب کچھ گڈ مڈ ہو جاتا...... اس کی سوچ کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہ رہ پاتی۔ وہ ایک کہانی لکھنا چاہتا تھا جو لکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ ایک شاہکار بنانا چاہ رہا تھا جو بن نہیں پا رہا تھا۔

مہینوں سے وہ جھنجھلایا ہوا تھا، بے چین تھا۔ گھر میں، گھر سے باہر، دوست و حباب میں، حتیٰ کہ کتابوں تک میں...... کہیں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا...... ندر ہی اندر ایک آگ تھی جو رات بھر اسے سونے نہیں دے رہی تھی۔ وہ کائنات کی ساری ہولناکیوں اور جملہ رنگینیوں کو صفحہ قرطاس پر پھیلا دینا چاہتا تھا۔ لیکن خرگوش کے ریگستان میں داخل ہوتے ہی اس کے دماغ میں تمام گتھیاں الجھ جاتیں۔ اس کو کہانی کے سارے سرے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے۔ کوئی نکتہ واضح اور روشن نہ رہ تا۔ سارا مواد اس کے ذہن سے دھواں بن کے بھک سے اڑ جاتا۔ کوئی کہانی، لوئی تصویر، کوئی شاہکار...... کچھ بھی اس کے ذہن میں نہ رہ پاتا۔

وہ پریشان، بے چین اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا اور سوچتا رہتا کہ شاید اس کے پاس لوئی کہانی نہیں ہے۔ شاید وہ کچھ لکھنا بھی نہیں چاہتا، وہ کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا، ماید کہیں کچھ ہے بھی نہیں، ہر شئے کھوکھلی ہے، خالی ہے...... خالی اور اس کے سوا لچھ بھی نہیں ہے...... شاید کچھ...... شاید......

وہ پھر سوچتا کہ وہ ایک کہانی لکھے گا...... بہت شاندار، شاہکار...... جس میں ائنات اور انسان کے پیچ کے تمام راز سربستہ اجاگر کر دے گا۔

آج پھر وہ صبح سے بیٹھا کاغذ کالے کر رہا تھا۔ لکھتا تھا اور پھاڑ دیتا تھا۔ خرگوش ں ریگستان میں ہر قلانچیں بھر رہا تھا...... ان سطروں کو لکھتے لکھتے رات کا ایک پہر

بیت چکا تھا۔ مجبور ہو کر اس نے اپنا قلم رکھ دیا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ موسم بے حد خراب تھا۔ تیز بارش، بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہوا بھی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنا قلم اٹھایا، چند سطریں لکھیں اور رک گیا۔ وہ سوچنے لگا، اور ساری سوچ کو ایک نقطہ پر لانے لگا۔ وہ سوچتا رہا، وقت گزرتا رہا، موسم کی خوفناکی سے بے خبر اس نے اپنے جسم کی تمام حسیات کو سمیٹ کر اپنے دماغ کی ایک باریک نوک پر جمع کیا اور اپنے اندر اترتا چلا گیا...... اندر بہت اندر...... شاید بہت گہرے میں......

کچھ دیر بعد اسے ایک سرسراہٹ کا احساس ہوا، آواز آہستہ آہستہ اس کے کمرے میں گونجنے لگی۔ پھر بالکل صاف اور واضح آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی......

''میں...... ں...... میں...... کہانی...... ہوں...... ں...... میں کہانی ہوں۔'' اس نے صاف سُنا۔

''تم میری ہی تلاش میں سرگرداں ہو۔ تم مجھے شاید ایران عراق کی جنگ میں ڈھونڈ رہے ہو، جہاں اب اسکولوں کے بچوں کو محاذ پر بھیجا جا رہا ہے......''

''تم شاید مجھے افغان مجاہدین میں تلاش کر رہے ہو، جہاں مساوات کا علمبردار تباہی اور بربادی مچا رہا ہے۔ سارے افغانیوں کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔''

''تم شاید مجھے پنجاب کے انتہا پسندوں میں ڈھونڈ رہے ہو...... جنہوں نے ٹرینوں میں، بسوں میں اور راہ چلتے کتنے ہی بے گناہوں کو قتل کیا ہے...... شاید تم مجھے سکھوں کی مقدس عبادت گاہوں پر ملٹری ایکشن میں ڈھونڈ رہے ہو جہاں آرمی نے سینکڑوں لوگوں کو مشین گنوں سے بھون ڈالا۔''

''تم شاید مجھے دہلی کے ہندو۔ سکھ فساد میں ڈھونڈ رہے ہو، جہاں اتنی تیزی سے آگ کے شعلے بھڑکے کہ جب تک لوگ کچھ سوچتے، سمجھتے، تب تک سینکڑوں بے گناہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے تھے اور انتظامیہ کے اعلیٰ حکام بہت بلندی

سے اس پورے منظر کو دیکھ رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔''

''تم شاید مجھے ناریل کے درختوں کے درمیان بیٹھی اس اداس نازک اندام حسینہ کی آنکھوں میں تلاش کر رہے ہو، جو کئی برس پہلے اپنے محبوب کو Cananore کے اسٹیشن پر سعودی عرب جانے کے لئے الوداع کہہ کر آئی تھی اور اب اس کو خوش آمدید کہنے کو ترس گئی ہے۔''

''تم شاید لوگوں کی آنکھوں میں کسی تازہ فساد کو بھول جانے کی بے حسی میں مجھے ڈھونڈ رہے ہو...... تم شاید ایوانوں میں پھیلی دوغلی سیاست میں مجھے تلاش کر رہے ہو۔ شاید سندر بن کے مزدوروں کی سوکھی ٹانگوں میں میری تلاش میں سرگرداں ہو...... شاید پیپل کی چھاؤں میں کھیلتے ننگے بچے کے الجھے ہوئے بالوں میں مجھے ڈھونڈ رہے ہو۔''

موسم بتدریج خراب ہوتا جا رہا تھا...... بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی کڑک بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں کسی طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کے کمرے میں آواز بدستور گونج رہی تھی...... ''میں کہانی ہوں...... کہانی ہوں...... کہانی ہوں...... ہوں...... ں......''

''تم مجھے شکاری اور خرگوش کے مابین ہی کیوں ڈھونڈ رہے ہو۔ میں تو تمہارے بالکل پاس میں موجود ہوں...... تم لکھو کہ...... لکھو کہ...... میں تمہارے محلے کی ڈھلتی عمر والی کنواریوں میں موجود ہوں۔ میں تمہاری گلی کے ان بچوں میں موجود ہوں جو صبح کو اسکول جانے کے بجائے بیڑی کے کارخانوں میں جاتے ہیں...... میں کہانی ہوں...... کہانی ہوں...... تم لکھو کہ...... میں تمہاری بیوی کے بوسیدہ لباس اور حسرت و یاس سے تم کو تکتی ہوئی اس کی آنکھوں میں موجود ہوں۔ میں تمہارے گھر کے آٹے، دال کے خالی کنستروں اور ڈبوں میں موجود ہوں...... میں کہانی ہوں اور تمہارے اندر تمہارے چاروں طرف موجود ہوں۔ تم مجھے کبھی بلبل کے نغموں اور کوئل کی کوک میں ڈھونڈنے کی کوشش کرو، تم کبھی درختوں پر

اچھلتی کودتی اور امرود کترتی گلہریوں میں مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کرو...... کبھی مہاوٹوں کی رات میں بانسری بجاتے گاؤں کے گوالے کی چھونپڑی میں مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرو...... میں کہانی ہوں...... کہانی ہوں...... تم لکھو کہ...... لکھو کہ...... میں کہا......

پاس ہی کہیں آسمان سے کڑکڑاتی ہوئی بجلی گری اور سارے ماحول میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ اس کے کمرے میں بھی سناٹا چھا گیا، بس ایک تھرتھراہٹ سی تھی جو باقی رہ گئی۔

OO

شکست بند

صبح کے اخبار میں مسز جیسوال کا قتل اور ندیم کی گرفتاری کی خبر پڑھ کر میں ششدر رہ گیا۔ اخبار کے مطابق مسز جیسوال کو بے رحمی سے قتل کیا گیا تھا۔ ان کے جسم پر بہت سے زخم تھے۔ خاص طور سے ان کے بدن کے پوشیدہ حصوں کو دھار دار ہتھیار سے مسخ کیا گیا تھا۔ ندیم نے نہ صرف قتل کا جرم قبول کر لیا تھا بلکہ وہ چاقو بھی پولیس کے حوالے کر دیا تھا جس سے اس نے مسز جیسوال کا قتل کیا تھا۔ خبر پڑھ کر میرا دماغ چکرا گیا کہ ندیم بہت ہی سیدھا سادہ اور بھولا انسان تھا۔ مراد آباد کے پاس ایک گاؤں میں پیدا ہوا، گاؤں سے شہر تک کا سفر اس نے بڑی محنت، مشقت اور ایمانداری سے طے کیا تھا۔ اس کی مخلص و محسن بیوی کے علاوہ اس کے دو خوبصورت بچے تھے۔ معقول نوکری اور ایک چھوٹا سا شاندار گھر تھا۔ وہ زندگی کو بہت ہی سیدھے سادے ڈھنگ سے دیکھتا تھا۔ اس کی سوچ و فکر میں کوئی الجھاؤ و تناؤ نہ تھا۔ ہموار زندگی بسر کرنے والا شخص کسی کا قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ بھی مسز جیسوال جیسی حسین اور جوان عورت کا...... یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا؟ میں نے جلدی جلدی اپنی چائے ختم کی، کپڑے بدلے اور ندیم کا حال معلوم کرنے کوتوالی پہنچا۔ وہاں پولیس آفیسر نے بتایا کہ ندیم کا چالان کر کے اسے سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا ہے، کیوں کہ مسز جیسوال یہاں کے گرلز کالج میں لیکچرار تھیں، شہر کی شاندار کالونی میں رہتی تھیں اور سیاسی حلقوں میں ان کی اچھی جان پہچان تھی۔ لہٰذا شہر میں کسی طرح

کے ہنگامے یا بدامنی کے مدِ نظر فیصلہ کیا گیا کہ ندیم کو فوراً جیل بھیج دیا جائے۔

دوسرے دن میں ندیم سے ملنے سینٹرل جیل پہنچا تو وہاں پر ایک جم غفیر تھا اور عجب افراتفری کا عالم تھا۔ یوں لگا کہ جیل میں بھی ایک دنیا آباد ہے۔ چند لمحوں کے لئے انتہائی ہتک آمیز انداز میں ندیم سے میری ملاقات ہو سکی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی ندامت، گھبراہٹ یا پریشانی کے آثار نہ تھے۔ اس کا ایک دم شانت وسپاٹ چہرہ، خلا میں گھورتی ہوئی آنکھیں...... مجھے ایسا لگا کہ دو راتوں میں اس نے صدیوں کا سفر طے کر لیا ہو۔ انکشافِ ذات اور عرفانِ کائنات کے مدارج اس پر وا ہو گئے ہوں۔ وہ دو راتوں میں ہی شگفتہ پھول سے چٹان میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جیل کے نمبرداروں کا مسلسل دباؤ تھا کہ ملاقات جلدی کرو اور باہر نکلو، اسی عالم میں میں نے ندیم سے پوچھا۔

"یار یہ سب کیا ہو گیا؟ تو نے ایسا کیوں کیا؟"

"بس ہو گیا، جانتے ہوئے بھی نہ جانے کیسے......!"

ندیم نے جملہ ادھورہ چھوڑ دیا۔ اس کی آواز ایک دم بدلی ہوئی تھی۔ میں نے شدت جذبات سے سرشار ہو کر جانے اس سے کیا کیا کہا...... "میں تجھے ہر حال میں بچاؤں گا۔ اچھے سے اچھا وکیل کروں گا۔ تو فکر مت کر...... میں ہوں نا۔" وہ چپ چاپ میری باتیں سنتا رہا اور خلا میں گھورتا رہا۔

ندیم سے مل کر میں واپس ہوا تو تھک چکا تھا۔ جسمانی تھکان سے زیادہ ذہنی تھکان تھی۔ واپس آ کر میں نے اس کی بیوی اور بچوں کو دلاسا دیا اور اس کی ضمانت کی تگ و دو میں لگ گیا۔ پولیس، وکیل اور عدالت کے چکر لگاتے ہوئے، ذہن میں ایک ہی سوال گل میخ کی مانند گڑھا ہوا تھا کہ کسی طرح جلد سے جلد ندیم کی ضمانت ہو جائے۔ یوں بھی اس شہر میں ندیم کا عزیز کوئی رہتا نہ تھا اور بچے چھوٹے تھے۔ میں اس کے بچپن کا ساتھی تھا اور ہم دونوں کے وجود کی تخلیق ایک ہی گاؤں کی مٹی سے ہوئی تھی۔ اتفاق سے ہم دونوں کا تقرر بھی ایک ہی شہر میں ہوا تھا۔ لہٰذا

بچپن کا دوست ہونے کے ناطے ندیم کے لئے میری ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے مسز جیسوال کا بھی خیال آتا کہ اتنی حسین اور خوبصورت عورت کا قتل، پھول جیسا نازک بدن، جسے ہاتھ بھی احتیاط سے لگانا چاہئے تھا، ندیم نے ہاتھ تو کجا، اُسے تیز دھار دار چاقو سے چھوا......

تین چار مرتبہ جیل کے چکر کاٹنے کے بعد جیل کا سارا نظام میری سمجھ میں آ گیا۔ اب میں ندیم سے اس وقت ملنے جانے لگا جب جیل میں قیدیوں سے ملائی کا وقت ختم ہو جاتا تھا۔ دراصل میں نے جیل کے ڈاکٹر سے دوستی کر لی۔ وہ شراب کا بے حد شوقین تھا۔ شراب کو جیٹھ بیساکھ کی دھوپ میں پانی کے لئے للچاتے پیاسے کی طرح ڈگڈگا کے پیتا تھا۔ مجھے جب بھی ندیم سے ملنا ہوتا تھا، میں سیدھے ڈاکٹر کے پاس پہنچتا تھا، وہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو جاتا اور جو عورت مرد مریض اس کے پاس ہوتے انہیں مغلظات گالیاں بکتا اور بھگا دیتا۔ میں جیب سے وہسکی کا اَدّھا نکال کر اسے دیتا۔ وہ وہسکی میرے ہاتھ سے ایسے جھپٹتا جیسے شکرہ گوشت کی بوٹی کو اور اسے تیزی سے دواؤں کی الماری کے پیچھے چھپا دیتا، ایک لمبا سانس لیتا اور ملازم کو آواز دے کر کہتا کہ ندیم صاحب کو بلا کر لاؤ۔ میں ندیم سے باتیں کرنے لگتا اور ڈاکٹر اسٹیل کے گلاس میں وہسکی لوٹ کر مزے سے پینا شروع کر دیتا۔ کئی بار میں نے ندیم سے پوچھا کہ اس نے مسز جیسوال کا قتل کیوں کیا؟ لیکن وہ ہر بار میرے سوال کو ٹال جاتا یا خلا میں گھورنے لگتا، یا کہتا۔

''بس ہو گیا...... نہ جانے کیسے......''

کچھ دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد ہائی کورٹ سے ندیم کی ضمانت منظور ہو گئی۔ وہ جیل سے گھر آ گیا۔ گھر آ کر اس نے اپنے آپ کو گھر میں قید کر لیا۔ مہم جو ناول اور تصوف پر بہت سی کتابیں اس نے اکٹھا کیں اور ان کے مطالعے میں مصروف رہنے لگا۔ ہر چند کہ میں نے سمجھایا کہ مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ہمیں متحرک ہو جانا چاہئے اور مقدمہ کی پیروی سنجیدگی سے کرنی چاہئے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ

ہوا۔ اُدھر میں بھی کچھ اپنے دفتر اور کچھ ذاتی معاملات میں مصروف ہو گیا۔

وقت کے پہیئے نے غیر محسوس طریقے سے اپنی دھری پر دو ہموار چکر پورے کئے تو ایک دن اچانک مجھے معلوم ہوا کہ ندیم اپنا شاندار گھر فروخت کر کے پسماندہ بستی میں ایک چھوٹے سے تنگ و تاریک کرائے کے مکان میں رہ رہا ہے۔ اس کے بچے اچھے اسکول نے نکل کر میونسپلٹی کے اسکول میں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے اپنی لاپرواہی اور بے پرواہی پر غصہ آیا۔ میرے ضمیر نے مجھ پر لعنت بھیجی اور میں ایک بار پھر ندیم کے مقدمہ میں پورے انہماک سے شامل ہو گیا۔ مقدمے کی سنوائی شروع ہو چکی تھی۔ گواہوں اور وکیلوں کی جرح کے بعد آخر وہ دن آ گیا جب عدالتؔ کو اپنا فیصلہ سنانا تھا۔

اور دنوں کی طرح اس دن بھی کچہری بھری ہوئی تھی۔ جیٹھ کے جھکڑ اور لُو نے درختوں کے پتوں اور شاخوں پر گرد کی موٹی تہیں جمادی تھیں۔ پیپل کے پتے اور برگد کے موٹے پتے ہوا کے جھونکوں سے شاخوں سے ٹوٹ کر گھروں، سڑکوں اور کچہری میں سرسرا رہے تھے۔ شدید گرمی کے باوجود کچہری میں خاصی بھیڑ تھی۔ میں کچھ جلدی ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ وکلاء اور دوسرے لوگ بھی وہاں آ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ندیم بھی کچہری پہنچ گیا۔ اس نے لمبا کرتا اور جینس پہن رکھی تھی، پیروں میں کولہاپوری چپل تھے۔ داڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ وہ ایک دم شانت تھا...... سمندر کے گہرے پانی کی طرح۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا جیسے ہنسی قہقہہ اس کے ہونٹوں کے پاس سے کبھی گزرا ہی نہ ہو۔ میں نے اس کو سلام کیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ندیم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے بے حد سرد اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''سفر کا وقت آ گیا ہے دوست...... تم رنجیدہ مت ہونا۔ اس سفر پر جاتے ہوئے میں بالکل بھی افسردہ نہیں ہوں۔ نہ ہی مجھے ندامت کا احساس ہے۔ ہاں اگر تم گاؤں جاؤ تو گاؤں کی مٹی سے، ہواؤں سے، پیڑوں اور پرندوں سے میرا اسلام

کہنا اور کہنا کہ میں ان سے شرمندہ ہوں۔ منزل پر پہنچنے کا عزم اور حوصلہ لے کر تو سب ہی نکلتے ہیں لیکن منزل سب کو مل جائے، یہ ضروری نہیں۔ گاؤں کے پاس والے مزار پر جو قدآور برگد کا پیڑ کھڑا ہے جسے دیکھ کر کسی بزرگِ برگزیدہ کا گمان ہوتا ہے، جس کی گھنی چھاؤں میں ہم گلی ڈنڈا اور گیند تڑی کھیلا کرتے تھے، شام کو جب اس پر بے شمار پرندے بیٹھے چہچہاتے ہوں اور اس شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی ہو تو ان سب سے کہنا کہ مجھے معاف کردیں۔"

"یہ تو کیسی باتیں کررہا ہے ندیم۔ ابھی عدالت کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ ایک لمبے عرصہ کی تھکاوٹ، اکتاہٹ، کوفت اور شکست خوردگی کے احساس سے مجھے نجات ملنے والی ہے۔"

ندیم شاید کچھ اور بھی کہتا کہ جج صاحب آگئے اور عدالت میں سناٹا چھا گیا۔...... پہلا مقدمہ ندیم کا ہی تھا۔ کئی صفحات کے لمبے فیصلے میں ندیم کو عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ مقدمہ ہارنے کے بعد ہم لوگ بھاری قدموں سے عدالت سے باہر آئے۔ ندیم کو پولیس والے پہلے ہی اپنے گھیرے میں چکے تھے۔ کچھ دیر بعد اسے قیدیوں کی گاڑی میں جیل لے جانے کے لئے بیٹھایا گیا تو میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں چیخیں مار مار کر رونا چاہتا تھا لیکن ضبط کرتا رہا۔ جیسے ہی گاڑی آگے بڑھی، میں نے الوداع کہنے کے لئے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ میں ندیم سے کہنا چاہتا تھا کہ ہم لوئر کورٹ سے مقدمہ ہار گئے تو کیا ہوا...... میں بہت جلد ہائی کورٹ میں اپیل کروں گا۔ لیکن ندیم دور...... بہت دور...... افق تا افق خلا میں گھور رہا تھا۔

میں شکست خوردہ، منوں بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہارا تھکا اپنے گھر آیا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، رومال سے چہرہ صاف کیا اور صوفے پر ڈھہ گیا۔ کچھ دیر بعد بیوی چائے اور ایک پلیٹ میں بسکٹ لے کر آئی اور کہنے لگی۔

"آج ندیم بھائی کے مقدمے کے فیصلے کی تاریخ تھی۔ کیا ہوا......؟"

"عمر قید...... اسے عمر قید ہوگئی۔" میں نے بیوی کو جواب دیا اور تھکاوٹ کے

باوجود ندیم کے گھر کی طرف چل دیا اس کے بچوں کو دلاسا دینے کے لئے۔

ایک بار پھر ندیم سے ملاقات کے لئے میرے جیل کے چکر شروع ہو گئے۔ جیل تو ویسی کی ویسی ہی تھی، بس جیل کا ڈاکٹر بدل گیا تھا۔ یوں تو ڈاکٹر بھی کیا بدلا تھا، بس شکل صورت اور جسم بدل گیا تھا۔ باقی سب کچھ پہلے والے ڈاکٹر جیسا ہی تھا۔ پہلے والے ڈاکٹر کی طرح ہی شان سے دارو پیتا تھا اور اسی شان سے گالیاں بکتا تھا۔ ساری عادات و اطوار پہلے والے ڈاکٹر جیسے ہی تھے لہٰذا میں ندیم سے بے روک ٹوک ملتا تھا۔ ملاقات ہونے پر ندیم کہتا تو کچھ نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹ چکا ہے۔ میں نے کئی بار مسز جیسوال کے قتل کی وجہ جاننی چاہی لیکن وہ ہر بار ٹال جاتا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔

''دوست! تمہاری سزا کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کر دی ہے۔ لیکن تم جانتے ہی ہو، اس قانونی Process میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ بعض اوقات مقدمے کی سنوائی اور فیصلہ ہونے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں تمہیں بتا دوں کہ وقت گھوم پھر کر ایک بار پھر وہیں پہنچ گیا ہے جہاں سے تم نے اپنی زندگی کی شروعات کی تھی، جدوجہد کی تھی۔ یعنی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے تمہاری بیگم بچوں کو لے کر گاؤں چلی گئی ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ گنگا میں اتنا پانی بہہ گیا کہ سب کچھ گم ہو گیا...... سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ کیا تم اب بھی مجھے نہ بتاؤ گے کہ مسز جیسوال کا قتل تم نے کیوں کیا؟''

''بتاؤں گا...... ضرور بتاؤں گا، اگر تمہیں نہ بتایا تو پھر کس کو بتاؤں گا۔ تم ایسا کرنا کہ ہفتے کے دن آنا۔ اس دن قیدیوں کی چھٹی ہوتی ہے۔ ملاقاتیوں کے لئے ہفتے کو جیل کے دروازے بند رہتے ہیں۔ میں اطمنان سے پورا واقعہ تمہیں بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے میرے بھائی...... اب میں چلتا ہوں۔'' میں نے ندیم کو خدا حافظ کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

ہفتہ کا دن تھا۔ آسمان میں بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار گر رہی تھی۔ میں نے جیل کے ڈاکٹر کے لئے وہسکی کی بوتل خریدی اور ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ میرے ہاتھ میں وہسکی کی بوتل دیکھ کر ڈاکٹر اپنی کرسی سے خوشی میں جھومتا ہوا یوں اٹھا جیسے اس کی حسین محبوبہ اپنی بانہیں پھیلائے تنہائی میں اس سے ملنے آئی ہو۔ اس نے میرے ہاتھ سے بوتل اُچکی اور دواؤں کی الماری کے پیچھے چھپا دی۔ ایک لمبا سانس لیا اور جو مریض اس کے پاس تھے انہیں فحش گالیاں بکیں اور اپنے پاس سے بھگا دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے اپنے خاص ملازم نمبردار کو آواز دی اور کہا۔ ''ندیم صاحب کو بُلا کر لاؤ۔''

ڈاکٹر خوشگوار موسم کا بھرپور لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے وہسکی کی بوتل کھولی، اسٹیل کے گلاس میں وہسکی لوٹی اور بڑے آرام سے پینا شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد ندیم وہاں آ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پاس ہی کھڑے آم کے پیڑ کے نیچے جا کر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ کچھ رسمی سی بات چیت کے بعد میں نے ندیم کو یاد دلایا کہ آج ہفتہ ہے۔ ندیم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مجھے یاد ہے۔'' اس کی آواز ایک دم بدلی ہوئی تھی...... ہولناک حد تک سرد...... اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

''چاند کو چھونے کی تمنا میرے دل میں ابھری تھی مگر وہ میری بیوقوفی تھی۔ چکور گاتا رہتا ہے اور اُڑتا رہتا ہے۔ مگر چاند کی گرد کو بھی نہیں چھو پاتا۔ صبح ہوتی ہے اور چاند روشنی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔''

''فلاسفی نہیں میرے بھائی...... مجھے تو واقعہ بتاؤ کہ یہ سب ہوا کیسے؟'' میں نے ندیم کو ٹوکا۔ وہ کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا اور میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''حسب معمول میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ ادھر سے بہت ہی مترنم آواز سنائی دی۔ ''میں مسز جیسوال بول رہی ہوں۔ میرا ٹیلی فون نمبر آپ نوٹ کر لیں، میں آپ کو تھوڑی سی تکلیف

دینا چاہتی ہوں۔ آپ شاید مجھے نا جانتے ہوں لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ مسٹر ندیم بول رہے ہیں نا!!''

''جی، میں ندیم ہی بول رہا ہوں۔ بتائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''آپ کے آفس کے سامنے ڈاکٹر شرما رہتی ہیں۔ میں ان کو کئی بار ٹیلی فون کر چکی ہوں۔ شاید ان کا فون ٹھیک نہیں ہے۔ آپ مجھے یہ معلوم کر کے بتا دیں کہ وہ آج رات 'کٹی پارٹی' میں آئیں گی یا نہیں۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گی...... تھینکس۔''

شکریہ کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔ میں ڈاکٹر شرما کو دیکھنے گیا لیکن وہ گھر پر تھیں ہی نہیں۔ میں نے مسز جیسوال کا نمبر ڈائل کیا اور انہیں بتایا کہ ڈاکٹر شرما گھر پر نہیں ہیں۔ لیکن مسز جیسوال فون رکھنے کو تیار نہ ہوئی۔ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں اور گفتگو کے دوران انہوں نے میرے گھر کا فون نمبر لے لیا اور میرے گھر پر رہنے کا وقت بھی معلوم کر لیا۔ یہاں سے میری اور مسز جیسوال کی دوستی کا آغاز ہوا۔'' ندیم اب پوری طرح پٹری پر آچکا تھا۔ وہ سنا رہا تھا اور میں پوری توجہ کے ساتھ اس کی آپ بیتی سن رہا تھا۔ بس بیچ بیچ میں 'ہاں'، 'ہوں' کرتا جاتا تھا۔

''ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے بے تکلف دوست ہو گئے۔ مسٹر جیسوال کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا تھا۔ مسز جیسوال کم عمری میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کی ایک چھوٹی سی بچی تھی جس کے ساتھ وہ اپنے فلیٹ میں تنہا رہتی تھیں اور اکثر ٹیلی فون پر آزادانہ باتیں کیا کرتی تھیں۔ ان کی آواز میں بلا کی کشش تھی۔ وہ جب مجھے فون کرتیں، میرے کانوں میں جل ترنگ سی بج اٹھتی۔ میں ان کی آواز کا اسیر ہو چکا تھا۔ ایک دن اُن کا فون آیا، کہنے لگیں۔ ''میں آج رات ۹ بجے آپ کو فون کروں گی۔ آپ اپنے کمرے میں تنہا رہنا۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لینا۔ میں آپ کو جنت کی سیر کراؤں گی۔'' میں رات کے ۹ بجنے کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔ آٹھ بجتے ہی میں نے اپنا کمرہ بند کر لیا۔ بیوی سے

کہا کہ مجھے ڈسٹرب نہ کرے، میں دفتر کا انتہائی اہم کام کر رہا ہوں۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ کانٹوں پر کاٹنے کے بعد کسی طرح رات کے ۹ بجے، مسز جیسوال کا فون ٹھیک وقت پر آیا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی رسمی گفتگو کرتی رہیں، اس کے بعد بولیں۔

''کیا آپ کمرے میں اکیلے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جی۔''

''کھڑکیاں اور دروازے بھی بند ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جی۔''

''اچھا یہ بتائیے، اس وقت آپ نے کیا پہن رکھا ہے؟''

''لنگی باندھے ہوئے ہوں اور کرتہ پہن رکھا ہے؟''

''اچھا اب آپ ایسا کیجئے......'' یہ کہہ کر جو مسز جیسوال شروع ہوئیں تو مجھے یوں لگا کہ میرا کمرا دہکتی ہوئی بھٹی میں تبدیل ہو گیا ہے اور میں اس میں بھن رہا ہوں۔ وہ بہت ہی خطرناک و ہولناک جنسی باتیں کر رہی تھیں، جو کہ بیان نہیں کی جاسکتیں۔ میری زندگی کا حیرت انگیز تجربہ کہ کوئی شریف عورت کسی شریف مرد سے اتنی ننگی باتیں بھی کر سکتی ہے!! آدھے گھنٹے تک وہ ٹیلی فون کے تاروں میں جنسی لاوا انڈیلتی رہیں اور میں جھلستا رہا۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابتداء میں مجھے لگا کہ مسز جیسوال جنسی بیماری یا دماغی خلل کا شکار ہیں، شاید میں ان کی کچھ مدد کر سکوں لیکن میں خود ہی ان کی آواز کی نغمگی کا قیدی ہو گیا۔ ایک دن میں نے ان سے شکایت کی کہ آپ سے گفتگو کر کے مجھے ساری رات نیند نہیں آتی، دل بے چین رہتا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگیں۔ '' آپ کوئی خواب آور دوا یا گولی لے لیا کرو۔ میں بھی خواب آور گولیاں لیتی ہوں۔ بہت مزا آتا ہے، اچھا بھی لگتا ہے اور نیند بھی بھرپور آتی ہے۔'' میں نے خواب آور گولیاں تو نہیں لیں البتہ شراب پینی شروع کر دی۔ اس کے بعد صورت حال یہ ہوئی کہ مسز جیسوال کے فون کم اور میرے فون زیادہ ہونے لگے۔ شام ہوتی، میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتا، کھڑکیوں کے پردے ڈالتا اور

وہسکی لے کر بیٹھ جاتا۔ پہلے پیگ کے بعد مسز جیسوال کو فون لگاتا، ہیلو ہائے کے بعد میں ان سے کہتا کہ وہ ٹیلی فون کے تاروں میں جنسی لاوا انڈیلنا شروع کر دیں اور وہ شروع ہو جاتیں۔ اس بیچ ان سے کئی ملاقاتیں بھی ہوئی۔ کالج کے فنکشن میں بھی انہوں نے مجھے بلایا اور خوب خاطر کی۔

اِدھر میری شراب نوشی بڑھتی جا رہی تھی اور ٹیلی فونوں کا سلسلہ بھی۔ میری بیوی اس سے بہت پریشان تھی لیکن کچھ کہتی نہ تھی۔ مسز جیسوال مجھے اپنی محبت کا بھرپور یقین دلا چکی تھیں۔ میں ان سے ملنے کی ضد کرنے لگا تھا۔ ملن بھی اکیلے میں اور رات کے سناٹے میں۔ وہ میری اس خواہش کو ہمیشہ ٹال جاتیں۔ بس ایک ہی بات کہتیں کہ میں تمہیں صرف ٹیلیفون پر ہی مل سکتی ہوں یا تم مجھے دور سے دیکھ سکتے ہو۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ میرے لئے ان کا یہ رویہ تکلیف دہ ہوتا جا رہا تھا کہ ٹیلیفون پر تو سب کچھ اور ملنے سے انکار۔ کئی ماہ اسی طرح گزر جانے کے بعد گھر میں پیسوں کی تنگی کا احساس ہونے لگا۔ میری شراب نوشی بلانوشی میں تبدیل ہو گئی اور ٹیلیفون کے بلوں میں بہت اضافہ ہو گیا۔ مسز جیسوال کو حاصل کرنے کی خواہش حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ ان کی طرف سے خاطر خواہ جواب نہ ملنے کی وجہ سے سخت الجھن ہونے لگی۔ الجھن جب حد سے بڑھ گئی تو وحشت میں تبدیل ہو گئی اور مسز جیسوال کو حاصل کرنے کا مجھ پر جنون سوار ہو گیا کہ اسی عالم میں ایک بارگی مجھے ایسا لگا کہ میں اس چکر سے باہر نکل آوں گا، اس چکر ویوہ کو توڑنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں اس پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک دن تعلیمی محکمے کا کلرک کسی کام سے میرے دفتر آیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس کے لئے چائے منگوا لی اور اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ اچانک اس نے مسز جیسوال کا ذکر شروع کر دیا۔ ان کا نام سن کر میں چونک گیا اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے بتایا کہ مسز جیسوال کے فلاں ڈاکٹر سے مشتبہ ہونے کی حد تک گہرے تعلقات ہیں۔ اکثر پارٹیوں میں ان دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ڈاکٹر ان کی جنسی کفالت بھی کرتا ہے۔ یہ سن کر میں چکرا

گیا...... رگوں میں دوڑتے ہوئے خون سے بھاپ اٹھنے لگی۔ میں دفتر سے باہر نکلا اور گھنٹوں شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کلرک کے کہے ہوئے جملے بارود بن کر میرے وجود کو زخمی کر رہے تھے۔ میرے اپنے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ شاید چھوٹی جگہ پر پیدا ہونے اور گاؤں میں پرورش ہونے کی وجہ سے، میں نے جو کچھ سنا وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ گھنٹوں یوں ہی سڑکوں پر گھومتے رہنے کے بعد میں نے طے کیا کہ مسز جیسوال کو فون کروں۔ لہٰذا ایک پی۔ سی۔ او سے میں نے ان کو فون کیا۔ فون پر میں نے بتایا کہ مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ فلاں ڈاکٹر کے ساتھ آپ کے جنسی تعلقات ہیں تو وہ گھبرا گئیں۔ جلدی جلدی انہوں نے انکار کیا، ان کی گھبراہٹ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہیں۔ میں فون رکھ کر پی۔ سی۔ او۔ سے باہر آیا۔ رات ہو چکی تھی۔ گھر آیا، شراب کی بوتل نکالی اور پینے بیٹھ گیا۔ نشے کی ترنگوں نے جب عقل پر قبضہ کر لیا، تب میں غصے اور جھلاہٹ سے پاگل ہو گیا۔ ایک پیگ اور پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پتہ نہیں کہاں سے میرے ہاتھ میں چاقو آ گیا۔ چاقو لے کر سیدھا میں مسز جیسوال کے گھر پہنچا...... آگے کیا ہوا یہ تم اخبار میں پڑھ ہی چکے ہو۔''

ندیم کی آپ بیتی سن کر میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کمر سیدھی کی۔ اسی وقت جیل کے ڈاکٹر کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز آئی۔ ''صاحب، اندھیرا ہونے کو ہے۔ اب قیدیوں کی گنتی ہوگی۔ آپ جائیں۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ندیم کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اس پر الوداعی نظر ڈالی، خدا حافظ کہا اور جیل سے باہر نکل آیا۔ OO

آگے کھائی ہے

(شان محمد خان کے نام)

اِس بار ماں کے خط کے ساتھ چچا کا خط بھی آیا تھا۔ چند دُعاؤں کے بعد چچا نے لکھا تھا۔ ”بیٹا تمہاری ماں اب سچ مچ اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہے۔ اس نے اپنے جسم کی ساری حسیات اور مثبت قوتوں کو اکٹھا کر کے اپنی آنکھوں میں جمع کر لیا ہے۔ وہ اپنی پتلیاں کھولے تمہارے آنے کی راہ تک رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ منفی قوتیں اس پر حاوی ہو جائیں اور اس کی پتلیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت کر دیں، تم ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر فوراً ہی اپنے گھر پہنچو کہ تمہاری ماں تمہیں دیکھ سکے اور اس کی موت کچھ آسان ہو جائے۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم اپنے چچا کے ایک ایک لفظ پر غور کرو گے اور اس بات کو سچ جانو گے کہ تمہاری ماں قریب المرگ ہے، تم اپنے گھر کی طرف کو اپنا سفر شروع کر دو گے۔ فقط تمہارا چچا۔“

شان محمد خاں نے چچا کے خط کے بعد ماں کا خط پڑھا اور آبدیدہ ہو گیا۔ اس نے اسی وقت چھٹی کی درخواست لکھی اور اسے منظور کرانے کے لئے باس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”سر...... یہ میری چھٹی کی درخواست ہے۔ میری ماں سخت بیمار ہے۔ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ وہ مجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ میں بھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ سر! میری درخواست منظور کر لی جائے۔ اس کے ساتھ میری ایک اور درخواست ہے۔ مجھے آپ اپنی کار لے جانے کی بھی اجازت دے دیں۔ وہ خاص

کار جس میں بیٹھ کر آپ شہر میں ہونے والی مخصوص دعوتوں میں جاتے ہیں اور جسے میں آپ کے مزاج کے مطابق سبک رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوں۔ کیوں کہ سر، میری ماں مر رہی ہے اور میں جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔ کار کے علاوہ دوسرے ذرائع اتنے تیز رفتار نہیں ہیں۔ اگر میری ماں میرے پہنچنے سے پہلے مر گئی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔ اس لئے سر، میری چھٹی کی درخواست منظور کر لی جائے اور کار لے جانے کی بھی اجازت دے دی جائے۔ میں ساری زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا۔"

"تم چھٹی پر جا سکتے ہو اور کار بھی لے جا سکتے ہو۔ اتنے دنوں سے تم اس کمپنی میں کام کر رہے ہو اور میں تم سے خوش ہوں، تم بہت اچھے ڈرائیور ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی ماں سے مل کر جلد واپس آ جاؤ گے اور کسی طرح کی شکایت کا موقع نہ دو گے۔"

"بہت بہت شکریہ جناب!!"

شان محمد خان نے اپنے مالک کا شکریہ ادا کیا اور آفس سے باہر آ گیا۔ اس کو ماں کی شدید یاد آ رہی تھی۔ لہٰذا اس نے جلدی جلدی اپنی روزمرہ کی ضرورتوں کا سامان اکٹھا کیا، ڈرائیور کی وردی اُتار کر کھونٹی پر ٹانگی، پینٹ شرٹ اور جوتے پہنے اور کمپنی کے گیراج سے مخصوص کار نکال کر سڑک پر آ گیا۔ ایک پیٹرول پمپ سے پیٹرول لیا، کار کی ٹنکی فل کرانے کے علاوہ کئی گیلن الگ سے لے کر اس نے گاڑی کی ڈکی میں محفوظ کر لیا۔ وہ کار لے کر جب شہر سے باہر نکلا تو شام ہونے کو تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پرندے قطار در قطار نیلگوں آسمان میں پرواز کرتے ہوئے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ شان محمد نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی، ہرے ہرے دھان کے کھیتوں کے پیچھے اونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھا، پھر اپنے آپ کو دیکھا۔ کسی بھی وجیہہ اور قد آور شخص سے وہ کسی بھی طرح کم نہ تھا۔ پھر اس نے اپنے تھُل تھُل گوشت اور مٹکے جیسی توند والے مالک کے

بارے میں سوچا۔ پھر اس شاندار کار کو دیکھا۔ ایک سگریٹ سلگایا، دو تین لمبے لمبے کش لئے اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ منہ سے بے اختیار سیٹی کی آواز نکلنے لگی۔ ایک بار اس نے سوچا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس کار کا مالک نہیں ہے۔ سفر کو آسان بنانے کے لئے اس نے گاڑی میں لگے کیسٹ پلے کو آن کر دیا۔ لیکن غزل کا عجیب شعر اس نے سنا......

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

کیسٹ پلے کو بند کر کے شان اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی یادداشت کے مطابق اس گاڑی میں ایسی کوئی کیسٹ تھی ہی نہیں جس میں غزل ہو۔ یوں بھی اس کا باس کسی طرح کی غزل سنتا ہی نہیں تھا۔ پھر اچانک یہ ''ہستی...... فریب...... عالم...... دام خیال......'' کہاں سے آگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر اور غور کرتا اس نے دیکھا کہ سامنے سڑک پر اس کا ایک شاگرد، جسے اس نے کار چلانی سکھائی تھی، کھڑا ہوا کار روکنے کا اشارہ کر رہا ہے۔

شان نے گاڑی سائڈ کر کے روک دی۔

''سلام استاد۔''

''سلام! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''کچھ نہیں استاد۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپکی والدہ بیمار ہیں۔ آپ ان کو دیکھنے گھر جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاگرد ہونے کے ناطے میری ذمہ داری ہوتی ہے کہ ایسے بُرے وقت میں مَیں آپ کا ساتھ دوں۔ سفر لمبا ہے۔ راستے میں بے شمار گھماؤ دار چکر پڑتے ہیں اور چوراہے تو قدم قدم پر ہیں۔ کہیں لال بتی ہوتی ہے کہیں نہیں۔ میری موجودگی سے آپ کو اکیلے پن کا احساس نہیں ہوگا اور میرے ساتھ ہونے کی وجہ سے سفر بھی آسان ہو جائے گا کہ ہر گھماؤ دار چکر پر میں آپ کو بتا سکوں گا کہ آپ کی ڈرائیونگ ڈریس کھونٹی پر ٹنگی آپ کی منتظر ہے۔''

"لاحول ولا قوۃ...... تم جیسے نامعقول اور نامراد شاگرد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے مشورہ دیتا ہے...... Idiot......" یہ کہہ کر شان محمد خان نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔

آسمان میں تارے جھلملانے لگے تھے، شان کو بہت تیز بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر اور گاڑی ڈرائیو کی اور اس کے بعد ایک اچھا سا ڈھابہ دیکھ کر اس نے گاڑی روک دی اور سوچنے لگا کہ وہ کھانے کے لئے کیا منگوائے، کہ اچانک اس نے دیکھا کہ ڈھابے کے پیچھے ایک شاندار گارڈن ہے۔ گارڈن میں مدھم روشنی ہے اور دھیمے سروں میں موسیقی کی آواز آرہی ہے۔ شان ٹہلتا ہوا گارڈن میں پہنچا تو دیکھا کہ بہت سے مرد اور عورتیں ہیں جو مستی میں چور ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ناچ گا رہے ہیں اور بیرے بہت ہی سلیقے سے وہسکی اور دوسرے مشروبات پیش کر رہے ہیں۔ ایک بیرا شان کی طرف آیا اور بولا۔ "وہسکی سر!" بیرے نے وہسکی سے بھرا ہوا گلاس شان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شان نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ بیرے نے احتراماً اپنا سر جھکایا اور آگے نکل گیا۔ کسی نے پہلی بار شان کو سر کہا تھا، اس تخاطب سے اس کی شریانوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی حدت میں اضافہ ہو گیا اور پورے جسم میں خوشی کی برقی لہریں دوڑنے لگیں۔ پہلا پیگ ختم کر کے شان نے دوسرا پیگ لیا اور گارڈن میں ٹہلنے لگا۔ دفعتاً اپنے کندھے پر اس نے کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک عورت اسے خوش آمدید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ عورت نے کہا۔ "ہیلو۔" جواب میں شان نے بھی "ہیلو" کہا۔ عورت کہنے لگی۔

"لگتا ہے آپ اس خوبصورت جگہ پر تنہا ہیں۔"

"جی ہاں! آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ میں یہاں تنہا ہی ہوں۔"

"آپ جیسا اسمارٹ آدمی میری کمپنی قبول کرے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"زہے نصیب محترمہ! میرا خیال ہے کہ یہاں کچھ روشنی ہے۔ اگر آپ پسند

فرمائیں تو ہم اُدھر گھنے پیڑ کے نیچے چلیں۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' شان نے کہا تو وہ عورت کہنے لگی۔

''روشنی اور اندھیرا، دن اور رات، یہ سب انسان کے اندر کی باتیں ہیں۔ یعنی ہمارے محسوس کرنے پر منحصر ہے۔ اگر ہم سوچ لیں کہ جہاں ہم کھڑے ہیں یہاں اندھیرا ہے اور ہم اپنے کپڑے اُتار کر یہاں عیش کر سکتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہاں اندھیرا ہی ہے۔ ویسے آپ کہتے ہیں تو گھنے پیڑ کے نیچے ہی چلتے ہیں، جہاں آپ کو اندھیرا نظر آتا ہے۔'' اس عورت نے اتنا کہہ کر ایک بیرے کو آواز دی۔ اس کی ٹرے میں سے دو گلاس اور ایک وہسکی کی بوتل اُٹھائی اور بولی۔ ''چلئے۔''

شان اور وہ عورت کچھ دیر پیڑ کے نیچے بیٹھے باتیں کرتے رہے اور وہسکی پیتے رہے۔ اس کے بعد رات گہری ہو گئی تھی اور شان محمد خان اس عورت کو اپنی آغوش میں لے کر لیٹ گیا تھا اور سو گیا تھا۔

صبح جب شان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر اپنے گھٹنے پیٹ میں دیئے سو رہا ہے۔ وہ اُٹھا اور جلدی سے اپنی کار سے باہر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں نہ کوئی ڈھابہ ہے نہ گارڈن ہے، نہ ہی ان چیزوں کے وہاں ہونے کے آثار ہیں۔ فقط سڑک ہے جہاں اس کی کار کھڑی ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ شان نے اپنے کپڑے ٹھیک کئے، ایک لمبی انگڑائی لی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور سفر شروع کر دیا۔ راستے میں کئی گھماؤ دار چکروں اور بے شمار چوراہوں سے گزرتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے ایک طرف بہت ہی خوبصورت جھیل ہے۔ اس نے گاڑی ایک طرف سائڈ کر کے کھڑی کر دی اور جھیل کی طرف چل دیا۔ جوتے موزے اُتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ پینٹ کو گھٹنوں سے اوپر کر کے وہ جھیل کے پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس نے پانی کے دو چار چھپاکے اپنے منہ پر مارے۔ پانی بہت ہی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی بیٹھا رہا، پھر رات ہو گئی اور پورا چاند چمکنے لگا۔ تب وہ اُٹھ کر کار کے پاس

آیا۔ جوتے وغیرہ پہنے اور سوچنے لگا کہ کھانے کا کیا بندوبست کیا جائے کہ اچانک اس کے نتھنوں سے گوشت کے بھننے کی مہک ٹکرائی۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے داہنی طرف کچھ فاصلے پر چھولداریاں پڑی ہیں جہاں سے گوشت کے بھننے کی تیز مہک آرہی ہے۔ شان سڑک سے اُتر کر چھولداریوں کی طرف چل دیا۔ وہاں پر اس نے دیکھا کہ بہت سارے لوگ جمع ہیں اور جشن منانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ شاندار اسٹیج بنا ہوا ہے، اس پر ایک شاندار کرسی رکھی ہوئی ہے۔ کرسی کے ہتھوں پر سونا منڈھا ہوا ہے اور ہیرے جڑے ہیں۔ شان محمد خان کو دیکھتے ہی ان لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ایک شخص کہتا ہے۔ ''وہ آگیا'' پھر بہت سے لوگ نعرہ بلند کرتے ہیں۔ ''وہ آگیا...... ہمارا قائد آگیا۔ ہمارا بادشاہ آگیا'' بادشاہ سلامت زندہ باد کے نعروں سے پوری فضا گونج اٹھتی ہے۔ بہت سے لوگ آگے بڑھ بڑھ کر شان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کا سردار آگے بڑھتا ہے اور شان کو ادب سے اسٹیج کی طرف لے جاتا ہے اور ہیرے جڑی ہوئی کرسی پر بیٹھا دیتا ہے۔ فضا میں ایک دم خاموشی چھا جاتی ہے کہ وہاں کی راجکماری اپنی سکھیوں کے ساتھ سونے کے تھال میں تاج لئے ہوئے اسٹیج کی طرف آتی ہے اور شان محمد خان کے سر پر تاج رکھ دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پوری فضا ایک بار پھر ''ہمارا بادشاہ زندہ باد'' کے نعروں سے گونجنے لگتی ہے۔ سب لوگ ناچنے، گانے اور جشن منانے لگتے ہیں۔ شان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اچانک ملی شہنشاہیت سے اس کا سینہ پھول جاتا ہے۔ اس کے بعد راجکماری شان کا ہاتھ پکڑ کر ایک خیمے کی طرف لے جاتی ہے اور کہتی ہے۔

''یہ آپ کی آرام گاہ ہے مہاراج!''

صبح جب آنکھ کھلی تو اسے حیرت ہوئی کہ وہ اپنی کار میں لیٹا تھا۔ وہاں نہ کوئی جھیل تھی نہ چھولداریاں تھیں۔ صرف سڑک سنسان اور ویران۔ شان نے دیکھا کہ اس کی گاڑی پر اتنی دھول جم چکی ہے کہ اس کا اصلی رنگ بھی نہیں پہچانا جا سکتا۔

گاڑی کے سارے پرزے دھول سے اَٹ گئے ہیں۔ گاڑی کسی دمے کے مریض کی طرح کھڑ کھڑ، پھڑ پھڑ کرنے لگی ہے۔

ایک بار پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چل دیا۔ تیز دھوپ تھی اور سڑک کے دونوں طرف لق و دق صحرا تھا۔ بہت دیر تک گاڑی چلاتے رہنے کے بعد شان کو خیال آیا کہ وہ سڑک پر تنہا چل رہا ہے۔ نہ تو کوئی گاڑی سامنے ہی سے آئی، اور نہ کسی گاڑی نے اس کی گاڑی کو اوورٹیک کیا ہے۔ دھوپ کی شدت سے ریت کے بگولے سے اُڑ رہے تھے اور کبھی کبھی سڑک ریت کی تہہ سے ڈھک جاتی تھی۔ چلتے چلتے شام ہو گئی، پھر رات ہو گئی لیکن اسے سڑک پر کوئی گاڑی آتی جاتی نظر نہیں آئی۔ رات کو اس نے ایک ندی کے پُل پر گاڑی کو روکا اور ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو اسے لگا کہ ندی کے بیچ و بیچ کچھ لوگ ناچ گا رہے ہیں۔ ندی بالکل سوکھی ہوئی تھی۔ اس میں فقط ریت ہی ریت تھی۔ شان پُل سے نیچے اُتر کر ندی کے بیچ و بیچ پہنچ گیا۔ لیکن وہاں کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ شان نے کئی عورتوں سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی عورت اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی، نہ ہی کسی مرد نے اس سے بات کی۔

شان مایوس ہو کر ندی کے اندر ایک چھوٹے سے ریت کے ٹیلے پر بیٹھ گیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ سوکھی ہوئی ندی کے اندر سے ایک پری نکلی اور وہ سیدھی اس کی طرف آئی۔ اس کے پاس آ کر وہ رُک گئی اور اس سے بولی۔ ''لگتا ہے تم یہاں تنہا ہو۔ یہاں آنے والا اگر کوئی شخص تنہا ہوتا ہے تو میں اسے کمپنی دینے آتی ہوں۔''

شان نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں جل پری ہوں۔ گو کہ یہ ندی سوکھ گئی ہے پھر بھی میں نے اپنا قیام نہیں بدلا ہے۔ میں اسی سوکھی ہوئی ندی میں مقیم ہوں اور جب بھی کوئی دکھی اور تنہا انسان یہاں آتا ہے تو میں اس کا دل بہلانے باہر آتی ہوں۔ آؤ...... تم میرے ساتھ

ناچو۔'' جل پری نے کہا تو شان محمد خان اس کے ساتھ ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے دیر ہوگئی اور رات کا آخری پہر ہوگیا تو وہ جل پری کو اپنے ساتھ لے کر سو گیا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ زمین پر پڑا سو رہا تھا، تیز سورج اس کے اوپر تھا اور گاڑی ایک طرف کھڑی تھی۔ شان نے اپنے کپڑوں کی دھول جھاڑی اور گاڑی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک خوفناک گہری اندھیری کھائی ہے۔ اس کو خیال آیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آخر اسے ہو کیا گیا ہے؟ آج تک کوئی سڑک کسی کھائی پر ختم نہیں ہوئی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ سڑک ایک اندھیری خوفناک کھائی پر ختم ہو؟ شاید اس کا دماغ ہی خراب ہوگیا ہے۔ کوئی سڑک بھلا کسی کھائی پر کیسے ختم ہوسکتی ہے؟ یہ سوچ کر شان محمد خان نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گیئر ڈال دیا۔ ○○

سبز وادی کا خواب

وہ تعداد میں چار تھے۔ چوتھا ابھی ابھی ان لوگوں میں آ کر شامل ہوا تھا۔
پہلے والے کی شکل آسیبی تھی۔ وہ بہت پُرانا داستان گو بوڑھا تھا۔ وہ لوگوں کو دیومالائی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اس کی داڑھی بہت لمبی اور بے ترتیب تھی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے اور بہت لمبے تھے۔ گھٹنوں سے نیچے تک کا کوٹ پہنے، ہاتھ میں ٹیڑھی میڑھی لکڑی تھامے وہ خود بھی اپنی داستان کا کوئی کردار معلوم ہوتا تھا۔ جب اس کی داڑھی مونچھیں سفید ہو گئیں اور کمر جھک گئی، تب بوڑھے نے اپنا مٹھی بھر سامان سمیٹا اور سرسبز و شاداب وادی کی طرف سفر شروع کر دیا۔ لیکن کچھ دنوں کی مسافت کے بعد بوڑھے داستان گو کے ہاتھ پیر جواب دے گئے اور مجبور ہو کر اسے ایک پہاڑ کے نشیبی غار میں پناہ لینی پڑی، وہیں اس نے اپنا الاؤ دہکا لیا۔

دیومالائی کہانیاں سنانے والے بوڑھے کے الاؤ کے پاس ہی دوسرے داستان گو کا الاؤ تھا۔ اس داستان گو کا چہرا نورانی تھا۔ سر کے بال، ڈاڑھی، مونچھ اور لباس سب سلیقے سے تھے۔ یہ لوگوں کو مذہبی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ ایک دن یہ بھی نئی زمینوں اور سبز وادی کی تلاش میں نکلا اور پہلے والے بوڑھے سے جا ٹکرایا۔ پھر وہیں اس نے بھی اپنا الاؤ دہکا لیا۔

اِن کے پاس ہی تیسرے داستان گو کا الاؤ دہک رہا تھا۔ اس کے سر پر فلیٹ ہیٹ تھی جس کے درمیان کا حصہ سرخ تھا۔ اس کی ڈاڑھی مونچھیں بھی سرخ تھیں

اور لباس بھی۔ یہ لوگوں کو مارکس، لینن اور ان کے ہم جو ساتھیوں کی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ ایک دن یہ بھی سبز وادی کی تلاش میں نکلا اور پہاڑ کے نشیبی غار میں جا پہنچا۔ اس طرح یہ تین داستان گو وہاں پر اپنا اپنا الاؤ جلائے بیٹھے تھے۔

پہلے والے کی بھوئیں اور پلکیں سفید ہو گئی تھیں اور اس کی چلم کے شعلے بھی ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ لیکن دوسرے اور تیسرے داستان گو کی بھوئیں اور پلکیں سیاہ تھیں۔ ان کی چلموں کی آگ پوری آب و تاب کے ساتھ دہک رہی تھی۔ ان دونوں کے پھیپھڑے بھی مضبوط تھے۔ یہ ایک ہی کش میں ڈھیر سارا دھواں حقے کی نَے سے کھینچتے اور غار کے دہانے کی طرف منہ کر کے چھوڑ دیتے۔

چوتھا، جو ابھی ابھی اِن تینوں میں آ کر شامل ہوا تھا، کلین شیو اور سادہ لباس میں ملبوس تھا۔ اس نے تیسرے کے برابر میں اپنا الاؤ دہکایا، چلم بھر کر اپنے حقہ پر رکھی اور دو تین لمبے لمبے کش لگائے۔ فلیٹ ہیٹ والے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم اپنی اپنی باری کی کہانیاں سنا چکے ہیں۔ اب تمہاری باری ہے۔ تم ضرور کوئی تازہ اور نئی داستان لے کر آئے ہو گے۔'' چوتھے نے تینوں کی طرف دیکھا، حقہ کا ایک لمبا کش لگایا اور سارا دھواں باہر کی طرف چھوڑتے ہوئے بولا۔

''میں کوئی داستان گو نہیں ہوں۔ میں نے کسی کا دل بہلانے کے لئے کبھی کوئی داستان نہیں سنائی۔ میں سبز وادی کی تلاش میں سفر پر نکلا تھا اور یہ محض اتفاق ہے کہ میں آپ لوگوں سے آملا ہوں۔ لیکن میرے پاس ایک کہانی ہے...... ایک نوجوان کی کہانی۔ میں وہ کہانی آپ لوگوں کو ضرور سناؤں گا۔ میں برسوں اس نوجوان کے ساتھ رہا ہوں۔ اس کی شہ رگ کے بالکل قریب، لیکن میں نے اس کو کبھی بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کے اتنا قریب ہوں۔ وہ نوجوان کیا سوچتا، کیا کرتا، کیا کھاتا، کیا پیتا اور کس کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا، میں سب کچھ جانتا ہوں۔ کیوں کہ میں پل پل اس کے ساتھ رہا ہوں۔ لیکن ایک بار...... ہاں ایک بار سارا راز کھل گیا۔''

چوتھے نے رک کر کچھ دیر اپنی سانسیں درست کیں، پھر تینوں کی طرف دیکھا، تینوں ہمہ تن گوش تھے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''وہ نوجوان جب کالج سے اپنی ڈگری لے کر نکلا تو کچھ کر گزرنے کی امنگ...... آسمانوں کی بلندی پر اپنا نام لکھ دینے کی خواہش...... عزم و حوصلہ ہمالیہ کی طرح ٹھوس...... ماں باپ کے سارے سپنے ایک ہی جست میں ساکار کر دینے کی چاہت...... اوپر سے ڈگری کا سہارا...... وہ جیسے آسمانوں میں اُڑ رہا تھا۔

لیکن عمل کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اس کے سارے خواب بکھر گئے۔ اسے لگا کہ وہ ڈگری لیتے وقت جو کچھ سوچ رہا تھا، سب غلط تھا...... باپ کے چہرے پر بڑھتی ہُوئی جھریاں اس کے اندرون کو توڑتی رہیں۔ وہ بھاگتا رہا...... دفتروں میں...... انٹرویوز میں...... کمپیٹیشن میں...... ایک طویل بھاگ دوڑ نے اس کو سر سے پیر تک ادھیڑ دیا۔ گھر میں ماں خاموش...... باپ چپ چاپ جھریوں زدہ چہرے سے بیٹے کو ناکام لوٹتے دیکھتا رہا۔

اس سے پہلے کہ وہ نوجوان ٹوٹ کر بکھرتا، اس نے اپنے آپ کو آزاد چھوڑ دیا اور یکبارگی ایسا لگا جیسے اس کی ساری بھاگ دوڑ ختم ہوگئی ہو۔ اس نے بہت خاموشی سے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹا اور رات کے سناٹے میں، جب سارا گھر نیند کی آغوش میں تھا، وہ اٹھا، اس نے اپنے گھر کے آخری طاق کو ٹٹولا اور اپنی ڈگری اس میں رکھ دی۔ ڈگری کے اوپر اس نے ایک شمع روشن کی اور قسم کھائی کہ وہ ضرور ایک دن اپنا نام آسمانوں کی بلندی پر لکھے گا لیکن بغیر کسی سہارے کے، جہاں وہ اپنی ڈگری کا بھی سہارا نہیں لے گا۔ پھر اس نے اسی اندھیرے میں اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں پر الوداعی نظر ڈالی اور گھر چھوڑ دیا۔

نئی ہمت، نیا حوصلہ، بغیر کسی سہارے کے وہ پھر سے عمل کی دنیا میں کود پڑا۔ شہر در شہر وہ بھاگتا رہا۔ موسم بدلتے رہے۔ بنجر زندگی میں بوند کی ایک آس لئے ایک دن وہ چمنیوں اور موٹروں کے شہر میں اُترا۔ رات کا تیسرا پہر تھا۔ اسے صبح

ہونے کا انتظار تھا۔"

کلین شیو والا چوتھا آدمی کچھ دیر کے لئے رکا، حقہ کا دم لگایا اور آگے کہنا شروع کیا۔ "نوجوان کی اس شہر میں صبح ہوگئی۔ اس کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو ریشم کے دھاگے بیچا کرتا تھا۔ وہ آدمی ضعیف ہو چکا تھا۔ اس نے نوجوان سے کہا کہ وہ بہت کم منافے پر اس کو ریشم کے دھاگے دے گا اور وہ جس بھاؤ چاہے ان دھاگوں کو بازار میں بیچ سکتا ہے۔ وہ صرف اپنے طے شدہ ریٹ ہی اس سے لے گا، باقی وہ کسی بھی بھاؤ بازار میں بیچے، اُسے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔

نوجوان بڑے جوش اور حوصلے کے ساتھ کاروباری دنیا میں داخل ہو گیا۔ بہت تھوڑے سے منافع پر اس نے دوکانداروں کو ریشم کے دھاگے فروخت کرنے شروع کر دئے۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم جمتے گئے۔ بازار میں دوکانداروں نے جس طرح سے اس کے ساتھ تعاون کیا تھا، اس کا دل اور حساس دماغ ان دوکانداروں کے تئیں بے انتہا احسان مند تھا اور وہ ان لوگوں کو اپنا خون تک دے دینے کا جذبہ رکھتا تھا۔

موم بتی پگھلتی رہی اور آہستہ آہستہ موم اس کی ڈگری پر پھیلتا رہا اور وہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا رہا۔

دن بڑے اور راتیں مختصر ہونے لگیں۔

ابھی وہ نوجوان مارکیٹ میں پوری طرح قدم جما بھی نہ پایا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ جو دوکاندار اس سے بہت محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے، اب ان کی نظریں بدلنے لگی ہیں۔ اس کے مال کا اٹھان اب کم ہو گیا ہے۔ وہ پریشان ہو اٹھا۔ آخر اس نے ایک تاجر سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے، اب آپ لوگ میرا مال نہیں لیتے اور نہ ہی اس محبت اور خلوص سے پیش آتے ہیں...... حالانکہ میں تو آپ لوگوں کے احسانات کا بہت ممنون ہوں اور اس کے بدلے میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔

تاجر نے اسے بہت ہی صاف اور مختصر الفاظ میں بتایا کہ...... ہمیں نہ جان

چاہئے اور نہ جذبۂ محبت، نہ قربانی نہ ایثار۔ ہمیں تو صرف کم سے کم ریٹ پر مال چاہئے اور ہم ہر نئے آنے والے کو اسی طرح تعاون دیتے ہیں، تاکہ وہ ہمیں کم سے کم دام پر مال دے...... اس طرح تم لوگوں کے پَر نہیں نکلتے اور اگر نکل بھی آئیں تو فوراً ہی جھڑ جاتے ہیں...... تاجر کی اس اکھڑی ہوئی زبان کو سن کر نوجوان جیسے آسمان سے گر پڑا۔ اس کے جذبے کی کوئی قدر نہ تھی۔ وہ بہت دل برداشتہ ہوا اور وہاں سے اٹھ کر ایک دوسرے تاجر کی دوکان پر گیا۔ لیکن اس کی زبان پہلے سے بھی زیادہ کڑوی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے تمام دکانداروں نے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جیسا کہ پہلے والے نے کیا تھا۔

دوکانداروں کے رویئے سے نوجوان کو زبردست ذہنی تکلیف پہنچی۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری...... وقت کے پھن پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے اس نے چند دوکاندوروں پر قناعت نہ کر کے ریشم کے دھاگوں کو ملک کی چاروں سمتوں میں پھیلا دیا۔ اس کا اس کو خاطر خواہ Response ملا۔ وہ ترقی کی کئی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

موم بتی پگھلتی رہی اور آہستہ آہستہ موم اس کی ڈگری پر پھیلتا رہا اور وہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا رہا۔

پُرانے دوکاندار اس کو بُرے وقت میں کئے ہوئے احسانات یاد دلا کر ذہنی کچوکے لگاتے اور کم سے کم داموں میں مال لیتے۔ وہ سوچتا کہ وہ تو اِن لوگوں کو اپنی جان تک دے دینے کا جذبہ رکھتا ہے، پھر یہ لوگ بار بار اپنے احسانات کیوں یاد دلاتے ہیں۔

ایک دن جب بے رونق چہرے تیزی سے اپنے دفتروں کی طرف رواں دواں تھے، ٹائپ رائیٹر اپنے غلافوں سے باہر آچکے تھے، فولاد کے حروف کاغذ کے سفید سینے پر پڑ کر تحریر کی شکل اختیار کر رہے تھے، کہ ایک دراز قد سانولی لڑکی نے نوجوان کے دفتر میں قدم رکھا۔ لڑکی چہرے کی بناوٹ اور چال ڈھال سے بہت ذہین اور

حساس معلوم ہوتی تھی...... نوجوان نے اس لڑکی کو اپنے دفتر میں کام دے دیا۔
نوجوان کا ریشم کے دھاگوں کا کاروبار ملک کی سرحدیں پار کر گیا۔ باہر کے ملکوں میں اس کی مانگ بڑھنے لگی۔
نوجوان اس سانولی سلونی دراز قد لڑکی پر مہربان ہو گیا۔ لڑکی اس کے احسانات کے نیچے دبتی چلی گئی...... کبھی کبھی وہ اپنے احسانات گنا کر لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھتا، لڑکی کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور آنکھیں نیچے جھک جاتیں...... وہ سوچتی کہ اس کے احسانات بہت ہیں۔ وہ ان کے بدلے میں کیا دے کہ ان کا بوجھ کچھ کم ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کرے۔
کلین شیو والے چوتھے آدمی نے اپنی چلم کے شعلوں کو درست کیا، حقہ کا ایک لمبا کش لگایا اور سارا دھواں غار کے دہانے کی طرف چھوڑتے ہوئے آگے کہنا شروع کیا...... ''موسم خوشگواری سے بدلتے رہے۔ وقت نوجوان پر مہربان تھا اور نوجوان سانولی دراز قد لڑکی پر...... لڑکی نوجوان کی مہربانیوں سے نا چاہتے ہوئے بھی کار اور بنگلے کی مالک بن گئی...... نوجوان اس کو اپنے احسانات یاد دلاتا، لڑکی اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتی۔ وہ ہر صورت میں اس ذہنی اذیت سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ لڑکی اپنا سب کچھ اس نوجوان پر نچھاور کر کے اس کے احسانات کا بوجھ کم کر دینا چاہتی تھی، تا کہ اس کا ذہن نوجوان کی گرفت سے آزاد ہو سکے۔
موم بتی پگھلتی رہی اور آہستہ آہستہ موم اس کی ڈگری پر پھیلتا رہا اور وہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا رہا۔
ایک شام جب بھیگی رات نے اپنے پر کھولے اور شبنم کی ہلکی ہلکی بوندیں پھولوں کی پتیوں پر جمنے لگیں...... تب سانولی لڑکی نے نوجوان کو اپنے بنگلے پر چلنے کی دعوت دی۔ بنگلے کی کیاریوں میں کھلے کالے گلاب کا ایک پھول توڑ کر لڑکی نے اس کے سفید کوٹ کے کالر میں لگا دیا۔ پھر آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ کمرے میں موسیقی کی مدھم دھنیں بکھری ہوئی تھیں، جن پر اس

سانولی لڑکی نے بے اختیار ناچتے ہوئے اپنے کپڑے اتارنا شروع کر دئے۔ جب اس کے جسم پر چڈھی اور بریزری رہ گئی تب اس نے نوجوان کے گلے میں اپنی سڈول باہیں ڈالتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ اس کی برا کا ہک کھول دے......

نوجوان کے جذبات انتہائی سرد تھے۔ اس نے لڑکی کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کپڑے پہننے کی ہدایت دی...... سانولی لڑکی کے پاس بس ایک ہی انمول ہیرا تھا، جو آج وہ نوجوان کے احسانات کے بدلے میں اسے سونپ دینا چاہتی تھی...... لیکن نوجوان کا اس کو ٹھکرا دینا اس کے جسم میں بجلیاں کوندھا گیا۔ لڑکی اپنی یہ ہتک برداشت نہ کر سکی۔ جوان جسم کی حرارت بھرپور جسارت بن گئی۔ لڑکی کسی ناگن کی طرح نوجواں کی طرف لپکی اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ پھر وہ اسی تیزی سے اپنے کپڑوں کی طرف پلٹی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔

تب میں اس نوجوان کے بالکل برابر سے باہر نکلا اور میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے اس لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ اُس کو تھپڑ مارنے پر مجبور کیوں کیا؟ شاید تم یہ سمجھتے تھے کہ جو سلوک تم اس کے ساتھ کرتے تھے، وہ اس سے بے خبر تھی۔ اسے تمہارے احسانات کا احساس نہیں تھا۔ تم بالکل غلط سمجھتے تھے۔ تم نے اس لڑکی کو ہمیشہ متاثر کرنے کی کوشش کی، مانوس کرنے کی نہیں۔ جبکہ تم نہیں جانتے کہ متاثر کرنے سے Contraductory جذبہ پیدا ہوتا اور اور مانوس کرنے سے Co-Operative۔ متاثر کرنے کے لئے تم اس کو اپنے احسانات میں دباتے رہے اور اس لڑکی کا ضمیر اس پر لعنت ملامت کرتا رہا۔ جب کوئی راستہ اس کو نہ ملا تو اس نے اپنا جسم تمہارے حوالے کرنا چاہا...... کاش تم نے اس کو مانوس کرنے کی کوشش کی ہوتی۔

نوجوان جیسے بہت گہری نیند سے جاگا۔ وہ چیخ پڑا...... "نہیں...... نہیں...... ایسا نہیں ہے...... میں شاید بھول گیا تھا۔ میں شاید لاشعوری طور پر اس کے ساتھ وہ سلوک کرتا رہا، جو میرے ساتھ ہوتا تھا۔ مجھے جو ذہنی جھٹکے پہنچائے جاتے تھے، میں

لاشعوری طور پر وہی ذہنی جھٹکے اس لڑکی کو پہچاتا رہا ہوں۔ لیکن اب مجھے احساس ہو گیا ہے۔ اب مجھے وہ لڑکی چاہئے۔ اس کا جسم چاہئے، اس کی قربت چاہئے، اس کا سب کچھ چاہئے۔''

کون جانے...... میں نے نوجوان کو بتایا...... کہ وہ بھی اپنے گھر کے کسی طاق میں اپنی ڈگری پر شمع جلا کر نکلی ہو......

بس یہیں سے میں نے وہ شہر چھوڑ دیا اور سبز وادی کی تلاش میں نکل پڑا۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ میں آپ لوگوں سے آملا ہوں۔ لیکن میرا سفر ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ میں تو بس چند ساعتوں کے لئے دم لینے کی خاطر یہاں ٹھہر گیا ہوں۔ میرا سفر سبز وادی کی تلاش میں آگے جاری رہے گا۔''

کلین شیو والے چوتھے آدمی نے اپنی کہانی سنا کر تینوں داستان گوؤں کی طرف دیکھا...... پہلے والے کے علاوہ، جس کی بھنویں اور پلکیں سفید تھیں، دوسرے اور تیسرے...... اور اب چوتھے داستان گو کی بھی چلمیں پوری آب وتاب کے ساتھ دہک رہی تھیں۔ تینوں نے اپنے حقوں سے ایک ایک لمبا کش لگایا اور سارا دھواں نشیبی غار کے دہانے کی طرف چھوڑ دیا۔ OO

کانچ کے ٹکڑے

میں اور عادل بہت دیر سے عادل کی نشست گاہ میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ عادل کے والدین دور کہیں گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ شادی اس نے کی نہیں تھی۔ تین کمروں کے مکان میں وہ تنہا رہا کرتا تھا۔ مجید نام کا ایک ملازم تھا جسے وہ حمید بھائی کہہ کر بلایا کرتا تھا۔ اکثر دوست شام کو عادل کے گھر ہی جمع ہوا کرتے تھے۔ اپریل کا پہلا ہفتہ ختم ہو رہا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا، ہوا بھی کچھ دھیمی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان خاموشی نے ہیبت ناک صورت اختیار کر لی تو گھبرا کر عادل گویا ہوا۔ کہنے لگا......

''کیا بات ہے میاں! آج اتنی گہری خاموشی کیوں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''کوئی نہ کوئی بات تو ہے۔ میں نے تمہیں اتنا مضمحل پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''عادل پیارے، آدمی جب بہت خوش رہتا ہے، تو کبھی کبھی اس کا اداس رہنے کو، چپ رہنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ سمجھو میں آجکل کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا ہوں۔''

''کیا اچھی فلاسفی میں لپیٹ کر جھوٹ بول رہے ہو۔ ابے جو شخص دوستوں میں بیٹھتے ہی چہکنے لگتا ہو، جس کے آنے سے محفل گل وگلزار ہو جائے، وہ یوں ہی اداس نہیں ہو سکتا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے؟''

’’کچھ نہیں یار۔ ہوا یوں کہ آج چھٹی کا دن تھا۔ دوپہر کو میں نے سوچا کہ بازار سے جاکر سبزی ہی لے آؤں، لہٰذا میں نے بیوی سے معلوم کیا کہ میں بازار جا رہا ہوں، کوئی سبزی تو نہیں منگوانی؟ اس سے پہلے کہ بیوی کچھ کہتی، میری بیٹی نے کہا...... ’’پاپا آپ بھنڈی لے کر آنا۔ بہت دنوں سے گھر میں بھنڈی نہیں بنی۔ میرا دل چاہ رہا ہے بھنڈی کھانے کو۔‘‘ میں نے میاں بچی کو ڈانٹ دیا کہ یہ بھنڈی بھی کوئی کھانے کی چیز ہے؟ اتنی بیکار اور واہیات سبزی...... لاحول ولا قوۃ۔ میرا یہ کہنا تھا کہ بیوی تو آپے سے باہر ہوگئی اور مجھے جی بھر کے سنائیں۔ کہنے لگی۔

’’تم بچی کی اتنی معمولی فرمائش پوری نہیں کر سکتے، پھر تم سے کسی اچھی چیز کی توقع تو کی ہی نہیں جا سکتی، اور جب آپ کو گھر میں اپنی ہی مرضی چلانی ہے تو پھر ہم لوگوں سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو آپ کا دل چاہے آپ وہ لے آئیں۔ بیوی بچے تو آپ کے کچھ ہیں ہی نہیں۔‘‘ بس یار عادل! اسی وقت سے اپنا موڈ خراب ہے۔ میرے خیال سے تو دنیا کا کوئی بھی شریف آدمی بھنڈی جیسی پلید سبزی نہیں کھاتا ہوگا۔‘‘

’’اُف فو! تو بھی بہت بھولا آدمی ہے۔ انتہائی معمولی بات سے اتنا ڈسٹرب ہو جاتا ہے کہ بس پوچھو ہی مت۔ دیکھ آج اپنے حمید بھائی نے بہت ہی شاندار چکن بنایا ہے۔ اپنا کپور کہہ کر گیا تھا کہ وہ باہر سے وہسکی کی بوتل لایا ہے۔ اب تک تو اسے آجانا چاہئے تھا۔ اگر خود کہیں اٹک گیا تھا تو کم سے کم وہسکی تو دے جاتا۔ اب تو یہ بھنڈی سنڈی کا چکر چھوڑ، چکن کھا اور وہسکی پی۔ آج کی شام اپنی ہے پیارے۔‘‘

’’کپور نے کتنے بجے آنے کو کہا تھا؟‘‘

’’سات بجے تک آنے کو کہہ گیا تھا۔ اب آٹھ بجنے والے ہیں، ابھی تک نہیں آیا۔ مجھے ہفتہ دس دن تک بھی اگر وہسکی پینے کو نہ ملے تو بھی مجھے پرواہ نہیں۔ لیکن ایک بار اگر پینے کا موڈ بن جائے تو پھر مجھ سے انتظار نہیں ہوتا۔ اس کپور کے بچے نے آج بور کر دیا۔‘‘

عادل یہ کہہ ہی رہا تھا کہ کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ کپور اپنے ہاتھ میں وہسکی کی بوتل لئے ہوئے داخل ہوا تو عادل اس پر اُبل پڑا۔

''تو نے یار کمال کر دیا۔ ایک گھنٹے سے انتظار کر رہے ہیں۔ چکن تیار ہے، سلاد تیار ہے، ٹھنڈا پانی، سوڈا...... سب کچھ ہے، بس وہسکی ہی نہیں ہے...... جناب غائب ہیں۔''

''لے بھئی لے...... وہسکی بھی آ گئی۔''

کپور نے وہسکی کی بوتل عادل کے ہاتھ میں دی اور کہنے لگا۔

''یارو! میں آتو وقت پر ہی جاتا، لیکن ہوا یہ کہ مسوری سے میری بیٹی آئی ہوئی ہے۔ اس کے اسکول کی ہفتہ بھر کی چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ آتے ہی اس نے رٹ لگائی کہ پاپا میں بھنڈی کی سبزی کھاؤں گی۔ اب یہاں شام ہی سے سبزی منڈی بند ہو جاتی ہے۔ میں نے یار سارا شہر چھان مارا، تب کہیں جا کر یہ بیکار سی سوکھی ہوئی بھنڈیاں ملی ہیں۔ بچی کی فرمائش تھی، میں ٹال نہ سکا۔ اسی وجہ سے لیٹ ہو گیا۔ تم لوگ دھیرے دھیرے وہسکی پیو، میں ابھی پانچ منٹ میں بھنڈیاں گھر دے کر آتا ہوں۔''

کپور یہ کہہ کر چلا گیا۔ عادل نے جلدی سے بوتل کھولی اور دو پیگ بنائے، چیئرس کہا اور ایک ہی جھٹکے میں گلاس آدھا کر دیا۔ میں نے کہا۔

''عادل، یہ کپور کی بیٹی بہت ہی ذہین ہے۔ مسوری میں کانونٹ میں پڑھتی ہے۔ اس کے باوجود یار اسے بھی بھنڈی پسند ہے، وہ بھی بھنڈی کھانا چاہتی ہے۔ لعنت ہے اس بھنڈی پر۔ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔''

''ایسا ہے کہ بھنڈی کھانے کی چیز ہے یا نہیں، اس پر بحث بعد میں کریں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ بھنڈی سے تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ جہاں تک مجھے یاد ہے، بھنڈی تمہاری بھی پسندیدہ سبزی تھی۔ پھر یہ اچانک بھنڈی سے نفرت کیوں؟ بتاؤ آخر بات کیا ہے؟ دیکھو کوئی بہانا مت بنانا، شراب کی پوری بوتل اپنے پاس ہے۔ غم کسی بات کا ہے نہیں۔ بس جو کچھ بھی کہنا سنبھل کر اور سچ کہنا۔''

''کیا مطلب...... تم ایک ہی پیگ پی کر مجھ سے اس لب ولہجہ میں بات کرنے لگے......!''

''لب ولہجہ ٹھیک ہے، بس اب تم شروع ہو جاؤ۔''

''یار عادل کیا بتاؤں۔لاؤ، ایک پیگ اور دو۔''

''ایک کیا تو دو لے اور جلدی سے سنا ڈال کہ ہوا کیا تھا۔''

''یار...... جس وقت میری بچی نے بھنڈی کی فرمائش کی اور میں نے اسے ڈانٹا تو مجھے خود بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے اُسے کیوں ڈانٹا۔ پھر میں نے غور کیا تو ایک واقعہ میرے ذہن میں اُبھرنا شروع ہوا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ میں اور راجیو ایک ساتھ ساحلی شہر میں تفریح کے لئے گئے تھے۔ ہم دونوں اس شہر میں شام ہونے تک پہنچ گئے تھے۔ نہا دھوکر ہم لوگوں نے چائے منگوائی اور بیرے سے پوچھا کہ یہاں رات بسر کرنے کے لئے بھی کچھ ملتا ہے یا نہیں۔ بیرا ہمارا اشارہ سمجھ گیا۔اس نے ہمیں ایک Beach کا نام بتایا اور کہا۔

''صاحب آپ فلاں Beach پر چلے جاؤ۔آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

لہٰذا میں اور راجیو اس Beach پر پہنچ گئے۔ پورے Beach پر بہار آرہی تھی۔ ملک کے کونے کونے کی لڑکیاں اور عورتیں وہاں موجود تھیں۔ نارتھ انڈین، ساؤتھ انڈین وغیرہ وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ ہم دونوں نے اپنے لئے دو لڑکیوں کا انتخاب کیا۔

میں نے جس لڑکی کو پسند کیا تھا وہ ہندی بیلٹ کی معلوم ہوتی تھی۔ان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے کر ہم اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔عیش ونشاط کی بساط بچھ گئی۔ میں نے بیرے کو چکن مٹن لانے کو کہا اور اس لڑکی سے، جسے میں نے اپنے لئے منتخب کیا تھا، معلوم کیا کہ وہ اپنی پسند کا کچھ کھانا چاہے تو اس نے جواب دیا۔

''میں بھنڈی کھانا چاہتی ہوں۔'' اس نے مزید کہا کہ ہر رات اس کا گاہک اسے چکن مٹن کے ساتھ ہی روندتا ہے۔آپ پلیز میرے لئے بھنڈی منگوائیں۔

میں نے بیرے کو آواز دی اور کہا کہ وہ ایک پلیٹ بھنڈی بھی لے آئے۔
بیرے نے کہا۔
''صاحب اِدھر بھنڈی نہیں ملتا۔ فش فرائی ملتا، بہت شاندار ڈش ہوتا صاحب بالکل میڈم کے جیسی لذت دیتا۔''
''شٹ-اپ، بکواس مت کرو۔ یہ لو سو کا نوٹ اور ٹیکسی پکڑ کر پورا شہر چھان مارو، سمجھے۔ مجھے بھنڈی چاہئے۔''
''او۔ کے۔ سر ہم دیکھتا ہے۔ لیکن ملنا بہت مشکل ہوتا سر۔''
''بس اب تم جاؤ۔''
بیرا چلا گیا۔ میں اور راجیو وہسکی کے گلاس ہاتھ میں لے کر لڑکیوں سے باتیں کرنے لگے اور لطف اندوز ہونے لگے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد بیرا واپس آیا اور کہنے لگا۔
''صاحب بھنڈی مل گیا ہے۔ اس کے لئے ہم کو ہائی وے پر جانا پڑا۔ وہاں پر ایک نارتھ انڈین کا ڈھابہ تھا۔ وہاں سے ہم لایا ہے۔ بھنڈی پندرہ روپے کا ہے۔ ٹیکسی کا بھاڑا ڈھائی سو روپیا ہے اور اپنا بھی ڈیڑھ گھنٹے کا لیبر ہے۔''
''کوئی بات نہیں۔ تم ایسا کرو، ۱۰۰ روپے میں سے پچاسی روپے اپنے پاس رکھو اور ٹیکسی کا کرایا میرے بل میں داخل کرادو۔''
''تھینک یو سر، تھینک یو ویری مچ۔''
میں اور راجیو دو تین دن وہاں گزار کر واپس آ گئے۔ لیکن یار مجھے معلوم بھی نہیں ہوا کہ میرے اوپر بھنڈی کا آسیب سوار ہو چکا ہے۔''
''اوہو...... تو یہ بات ہے۔ یہ لے چوتھا پیگ، اور پانچویں پیگ کے بعد کھانا کھائیں گے، سمجھے۔ اس کے بعد یہ بھنڈی سنڈی کا بھوت خود بخود تمہارے سر سے اُتر جائے گا۔''
''یار کپور نہیں آیا۔''
''لیکن وہسکی بہت شاندار لایا ہے...... جواب نہیں۔ کیا خیال ہے؟''

''ہاں! وہسکی اچھی ہے۔''

کچھ دیر بعد ہم دونوں نشے میں دھت ہو گئے۔ عادل نے آواز لگائی۔

''حمید بھائی کھانا لگا دو۔''

حمید بھائی نے کھانا لگایا۔ ہم دونوں نے کچھ کھانا کھایا، کچھ ٹیبل پر اور کچھ اپنے کپڑوں پر گرایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ عادل بولا۔ ''یار یہ اپنا کپور وہسکی بہت شاندار لایا تھا۔ گوڈ بلیس ہم۔''

''اچھا بھئی خدا حافظ! کل ملیں گے۔''

''شب بخیر۔''

''شب بخیر۔''

○○

صبح کو بیوی نے مجھے اٹھایا۔ بولیں......

''اٹھیئے، صبح ہو گئی اور باتھ روم میں جایئے۔ میں آپ کے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ گاؤں سے رات آپ کی والدہ تشریف لے آئی ہیں۔ اگر وہ آپ کو نشے کی حالت میں دیکھ لیتیں تو شاید اسی وقت مر جاتیں۔ آپ کے نام کی تو شرم وحیا ہے نہیں۔ جایئے باتھ روم میں جایئے اور ناشتہ کر کے اپنی والدہ سے ملئے۔ اتنے دنوں کے بعد آئی ہیں وہ۔ آفس جانے سے پہلے کوئی سبزی یا بکرے کا گوشت لا کر دے دینا۔ وہ پرہیز کا کھانا کھاتی ہیں۔''

میں اُٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد باتھ روم سے واپس آیا تو بیوی ناشتہ لگا چکی تھی۔ میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور چائے کا گلاس ہاتھ میں لے کر والدہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ سلام دعا کے بعد خیر خیریت کی باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ مجھے آفس جانا ہے۔ آپ پرہیز کا کھانا کھاتی ہیں۔ مجھے بتا دیں کہ میں آپ کے لئے کیا لا کر دوں۔ کوئی سبزی، یا بکرے کا

گوشت، یا جو بھی آپ پسند فرمائیں۔''

ماں نے کہا۔ ''بیٹا میں پرہیز کا کھانا کھاتے کھاتے تھک گئی ہوں۔ آجکل بازار میں ہری ہری لوک بھنڈیاں آ رہی ہوں گی۔ تو میرے لئے تو پاؤ بھر بھنڈیاں لا دینا۔'' یہ سن کر میرے ہاتھ میں دبا ہوا چائے کا گلاس فرش پر گر گیا اور ٹوٹ گیا۔ پاس ہی کھڑی میری بیوی نے ایک نگاہ غلط سے مجھے گھورا اور فرش پر بکھرے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں کو چننا شروع کر دیا۔ ○○

زرد پتّوں کی سرسراہٹ

برف پوش پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی تنگ سڑک پر میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈوبتے سورج کو دیکھتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ آج کا دن بھی بیکاری کی نظر ہو گیا۔

گاؤں کے بوسیدہ جھونپڑے میں دیے کی ٹمٹماتی ہوئی بھدی روشنی میں ماں منتظر ہو گی کہ آج اس کا بیٹا دال، آٹے، اور ہری سبزیوں سے بھرے ہوئے بورے لے کر گھر لوٹے گا اور کئی مہینوں کے بعد اس کے بھوکے معدے میں کچھ اچھی غذا جائے گی، اور اسی گاؤں کے تالاب کے کنارے سرد ہواؤں کے جھونکوں کو جھیلتی ہوئی میری محبوبہ، منتظر ہو گی کہ میرا محبوب آئے گا اور اسے دلہن بنا کر شہر لے جائے گا، اور گاؤں کی بے کیف زندگی سے نجات دلائے گا۔

اچانک کوئی میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ میں پلٹ کر دیکھتا ہوں، گھنی داڑھی اور اونی ٹوپی میں اس کا چہرہ چھپا ہوتا ہے۔ میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوں۔ وہ کہتا ہے۔

’’میں تمہارا دوست ہوں، تمہارا ہمدرد ہوں۔‘‘

اس کی آواز مجھے جانی پہچانی لگتی ہے۔ میں فوراً ہی پہچان جاتا ہوں کہ وہ کون ہے۔ وہ پھر کہنا شروع کرتا ہے۔

’’جنگل کے اس پار دور دور تک پھیلی ہوئی شاداب وادی ہے، جہاں تمہارے

اور تمہاری ماں کے لئے پھولوں سے لدا ہوا شاندار بنگلہ ہے، شاداب وادی میں تم اپنی محبوبہ کو اپنی پسند کے گھوڑے پر بٹھا کر وادی کی سیر کرا سکو گے۔ کیوں کہ تم اُس وقت انسان پر انسان کی مسلط کی گئی غلامی کا جوا اتار پھینکو گے اور خدا کی پناہ میں چلے جاؤ گے، یعنی مکمل آزاد ہو جاؤ گے، اور یہ سب کچھ تب ہی حاصل ہوگا جب تم اس جنگل کو پار کر جاؤ گے۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا اور بولا۔

"لیکن جنگل پار کرنا تو بہت مشکل کام ہے۔ جنگل کے جو خطرات ہیں وہ اپنی جگہ، اس کے علاوہ اس کے مسلح محافظ دستے ہیں۔ جنگل کیسے پار کیا جا سکتا ہے؟"

گھنی داڑھی اور اونی ٹوپی والا، جس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا، لیکن میں اس کی آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ کہنے لگا......

"ہم تمہیں ایسے جدید ہتھیاروں سے لیس کریں گے کہ جن کا جواب جنگل کے مسلح محافظ دستوں کے پاس نہیں ہوگا۔ ہم تمہیں ناقابل تسخیر بنا دیں گے۔ یوں بھی انسان کی انسان پر سے غلامی توڑنے کے لئے، خدا کی پناہ میں جانے کے لئے اور خوبصورت وادی حاصل کرنے کے لئے کچھ ہمت کرنا تو بہت ضروری ہے۔"

اس کے بعد اس کے ہاتھ کا دباؤ میرے کندھے پر بڑھ گیا اور میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

"شاباش...... کل آدھی رات کو حنان بن عیسیٰ کے یہاں پہنچنا۔ وہاں تمہیں تمہاری ضرورت کا سامان مل جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔

میں آدھی رات کو حنان بن عیسیٰ کے یہاں پہنچا تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ اندھیرے میں وہی جانی پہچانی آواز گونجی۔

"تمہاری ضرورت کی تمام چیزیں اِدھر ہیں۔ انہیں لو اور سورج نکلنے سے پہلے جنگل میں داخل ہو جاؤ۔" اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ میں نے سامان کی طرف دیکھا، سب سے پہلے اونی ٹوپی پہنی اور کوٹ اور لانگ بوٹ پہنے۔ ایک جدید

مشین گن میں نے اپنے ایک کندھے پر اور کارتوسوں سے بھری ہوئی پیٹیاں اپنے دوسرے کندھے پر لٹکا لیں۔ باریک نوک کی کٹار میں نے اپنے لمبے جوتوں میں رکھی۔ پانی سے بھری چھاگل اور کھانے کی چیزوں سے بھرا بورا میں نے اپنی پیٹھ پر لادے اور چل دیا۔

پو پھٹنے میں کچھ دیر باقی تھی۔ میں طے شدہ مقام پر وقت پر پہنچ گیا تھا۔ ہلکے اندھیرے میں، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اس مقام پر کچھ لوگ میرے جیسے لباس میں ملبوس، ہتھیار لئے پہلے سے موجود تھے۔ ایک بار پھر فضا میں وہی جانی پہچانی آواز گونجی۔

''نوجوانو! تمہاری منزل مشکل ہے ناممکن نہیں، اور مجاہد وہی کہلاتا ہے، جس نے مشکل سے بھی مشکل حالات میں جدوجہد کی، ہواؤں کے رخ موڑ دئے اور فتح حاصل کی۔ تم روشن مستقبل اور مکمل آزادی کی طرف سفر کرنے والے ہو۔ مکمل آزادی وہی ہوگی جس میں انسان، انسان کی مسلط کردہ غلامی کو اپنے کاندھوں سے اتار پھینکے گا اور خدا کی پناہ میں چلا جائے گا۔ جنگل سامنے ہے اور تم لوگ جنگل پار کرنے کی بھرپور صلاحیتیں رکھتے ہو۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ ہمت سے کام لو اور شاداب وادی کی طرف اپنا سفر شروع کرو۔ لاکھ دشواریاں کیوں نہ آئیں، تم ہمت مت ہارنا، ڈٹے رہنا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہر جگہ ہر مقام پر رب العزت تمہارے ساتھ ہے کہ تمہارا مقصد نیک ہے اور تم بدی کے خلاف نیکی کی جنگ لڑنے جا رہے ہو۔''

صبح کاذب کے آثار نمودار ہوئے اور ہم سب لوگ جو کہ تعداد میں اچھے خاصے تھے، جنگل میں داخل ہو گئے۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد گھنا جنگل شروع ہو گیا۔ ہم لوگ تیزی سے جنگل پار کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک جنگل بہت زیادہ گھنا ہو گیا اور سورج کی تیز شعاعیں جنگل کی زمین کو چھونے سے قاصر ہو گئیں، تو گولیوں کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔

میں نے اپنے اطراف میں اپنے ساتھیوں کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس گولیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گولی کون چلا رہا تھا، کس پر چلا رہا تھا، کس سمت سے چلا رہا تھا، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس کے بعد ہیوی آرٹلری سے گولے داغے جانے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میرا ہاتھ بے اختیار مشین گن کے ٹریگر پر چلا گیا۔ مشین گن سے گولیوں کا فوارہ نکل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کچھ پتے جلے اور کچھ اِدھر اُدھر اُڑ گئے۔ اب مجھے چاروں طرف سے ہیوی آرٹلری سے گولے داغے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں، اور میں بے تحاشہ چاروں طرف گھوم گھوم کر میشن گن سے فائرنگ کر رہا تھا۔

کارتوس کا آدھا اسٹاک ختم ہونے کے بعد میں نے سوچا کہ ''میں کس پر فائرنگ کر رہا ہوں؟ میرا دشمن کون ہے؟؟ میری مشین گن سے نکلی ہوئی گولیاں کس کو لگ رہی ہیں؟؟؟ کہ ہیوی آرٹلری سے نکلا ہوا گولا میرے بالکل پاس آ کر گرا اور اس کی دھمک سے میری مشین گن میرے ہاتھ سے نکل کر کہیں دور جا گری۔ میں نے اسے ٹٹولنا شروع کیا۔ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مشین گن کو ڈھونڈنے میں میرا لباس تار تار اور جسم لہولہان ہو گیا۔

میں ایک جھاڑی سے نکلتا تو دوسری میں پھنس جاتا، اور دوسری جھاڑی سے نکلتا...... تو تیسری جھاڑی میں پھنس جاتا اور تیسری سے نکلتا تو چوتھی میں پھنس جاتا۔ اپنے تحفظ کے لئے اپنے لونگ بوٹ میں اُڑسی ہوئی پتلی نوک کی کٹار تلاش کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کٹار ہی نہیں پیروں سے لونگ بوٹ بھی غائب ہیں اور پیر بُری طرح زخمی ہیں۔

پانی کی چھاگل خالی ہو چکی تھی، اشیائے خورد و نوش کا تھیلا کب کا خالی ہو چکا تھا۔ ہیوی آرٹلری سے مسلسل گولے داغے جا رہے تھے۔ ایک گولہ میرے بالکل پاس آ کر گرتا ہے اور میرا ایک بازو میرے جسم سے الگ ہو جاتا ہے۔ ایک اور گولہ میرے برابر میں آ کر گرا، اس نے کئی جگہ سے میرے جسم کا گوشت اُدھیڑ دیا۔ بہتے

ہوئے خون کو روکنے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ اب اپنی زندگی کی شام یقینی ہے کہ اچانک پھر وہی جانی پہانی آواز فضا میں گونجتی ہے۔

تم ناقابل تسخیر ہو۔ دشمن تمہاری مشین گن کا راز جان گیا ہے اور اُس نے اِس کا توڑ پیدا کر لیا ہے۔ لیکن اب ہم تمہیں ایک بیٹری دے رہے ہیں، نایاب Atomic Battery، اس کا بٹن دباتے ہی آگ کا ایک لمبا شعلہ نکلے گا۔ جس سمت اس کا رخ ہوگا اُدھر آگ ہی آگ ہوگی۔ یہ ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا اور مجھے لگا کہ کوئی میرے ہاتھ میں بیٹری تھما رہا ہے اور میرے کان میں پھسپھسا رہا ہے۔

''شاداب وادی تمہاری منتظر ہے، ہمت مت ہارنا، تم فتح کے قریب ہو۔ آگے بڑھو۔''

ہیوی آرٹلری سے گولے داغے جانے کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ایک گولہ تیز روشنی بکھیرتا میری جانب آرہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے بوسیدہ جھونپڑے میں ماں میری منتظر ہے اور تالاب کے کنارے سرد ہوا کے جھونکوں کو بے جگری سے جھیلتی ہوئی محبوبہ منتظر ہے، اور یہ گولہ مجھے گور میں پہچانا چاہتا ہے۔ میں نے تیزی سے اپنی Atomic Battery اٹھائی اور گولے کی جانب اس کا رخ کر کے Swich on کر دیا۔ بیٹری کے اندر سے ایک بلی برآمد ہوئی جو کہ میاؤں، میاؤں کرتی ہوئی جنگل میں غائب ہو گئی۔ OO

آگ اور پتنگے

رات کے گہرے سناٹے کو چیرتی ہوئی گولی چلنے کی آواز سے بے خبر خراٹے دار نیند سو رہے گاؤں کے لوگ اچھل پڑے۔ کچھ خوف کے مارے اپنی چار پائیوں کے نیچے چھپ گئے...... مسلسل گولیاں چلنے کی آوازوں کے بیچ، احمد کی بیوہ زمیں بیگم کی حویلی سے لوگوں کے چیخنے چلاّنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان کی حویلی کی چھت پر کچھ لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا اور وہ لوگ چھت پر سے صحن میں گولیاں داغ رہے تھے۔

زمیں بیگم کو بیوہ ہوئے ایک عرصہ بیت چکا تھا۔ وہ اپنے دیوروں، دیورانیوں، بیٹے، بیٹیوں اور ان سب کے بچوں کے ساتھ چند چھوٹے چھوٹے مٹی کے بنے ہوئے گھروں کی ایک حویلی میں رہتی تھیں۔ پورے گاؤں میں سب سے زیادہ عمر کی ہونے کی وجہ سے، گاؤں کے سب چھوٹے بڑے انہیں امّاں کہہ کر پکارتے تھے۔ امّاں حویلی کے جس حصہ میں رہتی تھیں، وہ حصہ سرنگ نما دالان اور چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں پر مشتمل تھا۔ دالان کے آگے لمبا چوڑا صحن تھا، جس کے بیچ میں پھونس کا چھپر پڑا ہوا تھا، جہاں ان کی بھینس بندھتی تھی۔ ایک طرف پانی کے لئے ہینڈ پمپ لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی غسل خانہ اور پاخانہ تھا۔ حویلی کے اندر آنے کے لئے اور باہر جانے کے لئے موریاں بنی ہوئی تھیں۔

چھت پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ حویلی کے سب چھوٹے بڑے باشندے

اپنی جان بچانے کے لئے، امّاں کی سرنگ نما کوٹھریوں میں پناہ گزیں تھے۔ ان لوگوں کو لگ رہا تھا کہ انہیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہے، جو اُن کو ماریں گے بھی، لوٹیں گے بھی اور جوان بہو بیٹیوں کی آبرو کو بھی خطرہ ہے۔ لہٰذا وہ سب مل کر زور زور سے چلاّ رہے تھے۔ ''ڈاکو آگئے بچاؤ...... گاؤں والو ڈاکو آگئے بچاؤ۔'' حویلی سے باہر نکلنے والے دروازوں کی کنڈیاں ڈاکو پہلے ہی آگے سے بند کر چکے تھے، تاکہ حویلی کے اندر کے لوگ باہر نہ نکل سکیں۔

زمیں بیگم کا کنبہ مسلسل چیخے جا رہا تھا۔ ''ڈاکو آگئے بچاؤ۔'' لیکن انہیں بچانے کے لئے یا ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کے لئے گاؤں کا کوئی آدمی نہیں آ رہا تھا۔ جو لوگ گولی چلنے کی آواز سن کر چارپائیوں کے نیچے چھپ گئے تھے، وہ حویلی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں اپنے نادار اور بے سہارا ہونے کا شدید احساس تھا۔

جب امّاں کا کنبہ چیختے چیختے تھک گیا تو وہ سب لوگ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ چھت پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ گاؤں والوں کی خاموشی دیکھ کر امّاں کے بڑے بیٹے نے کہا۔

''آخر گاؤں کے لوگ ہماری مدد کو کیوں نہیں آ رہے ہیں؟'' یہ سن کر چھوٹے بیٹے نے کہا۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ چھت پر جو لوگ ہیں وہ ڈاکو ہیں ہی نہیں۔ ورنہ پورا گاؤں اس طرح مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے کیوں ہوتا؟''

''ہو سکتا ہے تیری بات ٹھیک ہو، کیوں کہ ڈاکو اس طرح آتے ہی نہیں، اور ویسے بھی یہ پہاڑی علاقہ تو ہے نہیں، جہاں ڈاکوؤں کے ہونے کی خبریں آ رہی ہیں...... ہمارے علاقے میں تو دور دور تک ڈاکوؤں کے ہونے کی خبر تھی ہی نہیں۔ پھر اچانک یہ ڈاکو کہاں سے آگئے۔'' بڑے بیٹے نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

''مجھے تو آج شام ہی سے کسی انہونی کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔'' چھوٹا پھر بول اٹھا۔

''وہ کیسے؟''

''آج شام ہی سے کتے منہ اوپر اٹھا کر رو رہے تھے۔ پرندے بھی بہت جلد اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ گئے تھے۔ گلی کوچوں میں بچے بھی نظر نہیں آ رہے تھے اور پھر اس بے موسم میں دور کسی گاؤں سے ڈھول بجنے کی آواز آ رہی تھی، جیسے کوئی خاص قسم کا پیغام کچھ خاص لوگوں کو بھیجا جا رہا ہو۔ فضا پر شام ہی سے نحوست چھائی ہوئی تھی۔''

''یہ سب باتیں بند کرو اور یہ معلوم کرو کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟'' زمیں بیگم نے بہت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''اگر یہ ڈاکو ہیں تو ان سے کہو کہ یہ اپنا ایک آدمی نیچے بھیج دیں۔ وہ ہماری پوری حویلی کی تلاشی لے لیگا۔ آخر ہمارے پاس ہے ہی کیا؟''

''یہ بات نہیں ہے اماں۔'' بڑے بیٹے نے کہا۔

''یہ لوگ ہمیں صرف لوٹنے ہی نہیں آئے ہیں، اگر یہ صرف لٹیرے ہوتے تو اب تک پورا گاؤں ہماری مدد کو آ چکا ہوتا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس ہتھیار ہیں یا نہیں۔ اگر ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ہم خالی ہاتھ ہیں تو یہ لوگ نیچے اتر آئیں گے اور ان سرنگ نما کوٹھریوں میں ہمیں کاٹ کر گاڑ دیں گے، اور اس حویلی کو مسمار کر دیں گے۔''

''یعنی ہمیں بے نام قبروں میں سلا دیں گے۔'' چھوٹے بیٹے نے کہا۔

''تم ان لوگوں سے بات تو کرو۔'' اماں نے سخت لہجے میں اپنے بڑے بیٹے سے کہا۔ اس نے گھبرا کے اپنا منہ دروازے کے کواڑوں کی جھری میں لگایا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

''بھائیو! ہماری بات سنو۔ آپ اپنا ایک آدمی ہمارے پاس نیچے بھیج دو۔ وہ ہماری پوری حویلی کی تلاشی لے لے گا کہ ہمارے پاس کیا ہے اور کیا نہیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کو کچھ چاہئے جو کہ آپ کے خیال میں ہمارے پاس ہے، تو وہ بھی آپ لے لیجئے۔'' جواباً چھت پر کھڑے ہوئے ایک آدمی نے، جو اس گروہ کا

سرغنہ معلوم ہوتا تھا، مغلظات گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

''تم جنم جات ملیچھ اور دغاباز ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم نے پورے گاؤں کو اڑانے کے لئے حویلی کے اندر گولہ بارود جمع کر رکھا ہے۔ تم ہمارے ایک آدمی کو نیچے بلا کر اسے قابو میں کرلو گے اور ہمیں بلیک میل کرو گے کہ یہ تمہاری صدیوں پرانی پریکٹس ہے۔ تمہارے پوروجوں نے تمہیں عیاری و مکاری کی ہی شکشا دی ہے۔ اچھے سنسکار کیا ہوتے ہیں یہ تم نہیں جانتے۔ ہم اس طرح کے بے شمار دھوکے تم سے کھا چکے ہیں۔ اب نہیں کھائیں گے۔ پہلے ہم تمہیں اس حویلی میں زندہ گاڑیں گے۔ اس کے بعد جو تم نے گولہ بارود جمع کیا ہوا ہے، اس پر قبضہ کریں گے۔'' اس کے ساتھ ہی کئی فائر ہوئے۔ پھر اچانک پوری فضا پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد حویلی والوں کو چھت کے دوسرے کونے سے نرم وملائم، کچھ جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔ ''تم لوگ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر باہر نکل آؤ تو ہم تمہیں معاف بھی کر سکتے ہیں کہ ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں۔'' یہ سن کر بڑے بیٹے نے اماں کی طرف دیکھا۔ اماں نے ہاں میں سر ہلایا۔ بڑے بیٹے نے دالان کا دروازہ کھولا اور باہر جھانکا تو معلوم ہوا کہ دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ گولیوں کی بوچھار دروازے پر آ کر لگی۔ اگر بڑا بیٹا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ زمین پر لیٹ نہ گیا ہوتا تو کئی گولیاں اس کا بھیجا چھلنی کرتی ہوئی دیوار میں جا لگی ہوتیں۔

اس کے بعد اپنی ہی حویلی میں گھرے زمیں بیگم کے کنبہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ خوف کی لہروں نے ان کے اعصاب ٹھنڈے اور دماغ سن کر دئے، اور وہ چھپنے کے لئے کونے کھدرے ڈھونڈنے لگے۔ یہ دیکھ کر زمیں بیگم کی آواز بلند ہوئی، وہ بولیں۔

''اس طرح چھپنے کے لئے چوہوں کے بھٹ ڈھونڈنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایسا کرو کہ صحن کے چھپر میں جہاں بھینس بندھی ہے، آگ لگا دو۔''

''آگ لگانے سے کیا ہوگا؟'' چھوٹے بیٹے نے سوال کیا۔

''پورا گاؤں جو کہ مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے، متحرک ہو جائے گا۔

سب اپنے چھپروں کو بچانے کی خاطر ہمارے گھر میں لگی آگ بجھانے دوڑ پڑیں گے۔'' زمیں بیگم کی ٹھہری ہوئی پُر اعتماد آواز سن کر ان کے پورے کنبہ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ چھوٹے بیٹے نے ایک اور سوال کیا۔

''ہمارے گھر میں لگی آگ کو گاؤں والے کیوں کر بجھانے آئیں گے، جو کہ ہمیں ڈاکوؤں سے بچانے نہیں آئے۔'' اس بات کا بڑے بیٹے نے جواب دیا۔

''گاؤں والے ہمیں بچانے نہیں آئیں گے، وہ آگ بجھانے آئیں گے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے ہمارے گھر کی آگ نہیں بجھائی تو اس تیز ہوا میں پتنگے اُڑ کر ان کے چھپروں پر جا گریں گے۔ تو ان کے گھر خود بہ خود دھوں دھوں کر کے جل اُٹھیں گے۔ لہٰذا وہ اپنے گھروں کو آگ کی لپٹوں سے بچانے کے لئے ہمارے گھر کی آگ بجھانے دوڑے آئیں گے۔''

''جب آگ لگے گی تو روشنی بھی ہوگی اور روشنی ہوگی تو چھت پر جو لوگ بندوقیں اور رائفلیں لئے کھڑے ہیں، ہم ان کو پہچان سکیں گے کہ وہ واقعی ڈاکو ہیں یا ڈاکو نما ہیں۔ اندھیرے کی نفسیات الگ ہوتی ہے اور اُجالے کی الگ۔ اُجالے میں بڑے سے بڑا پاپی بھی شریف ہونے کا ڈھونگ کرتا ہے۔'' زمیں بیگم نے بہت ہی ہموار لہجے میں اپنی بات کہی۔

''لیکن جن گھروں پر چھپر نہیں ہیں اور جو لوگ پختہ مکانوں میں رہتے ہیں، وہ کیوں کر ہمارے گھر کی آگ بجھانے آئیں گے؟'' چھوٹے بیٹے نے پھر ایک بار اپنا شک ظاہر کیا۔ اس پر بڑا بیٹا کہنے لگا۔

''پختہ مکانوں میں رہنے والے بھی آئیں گے بلکہ وہ چھپر والوں سے پہلے آئیں گے۔ انہیں دھوئیں کا خوف ہی ہمارے گھر کی آگ بجھانے کے لئے مجبور کر دے گا۔ یوں بھی پختہ مکانوں میں رہنے والے لوگ زندگی کا مطلب دوسروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ معمولی سا دھواں ان کا دم گھوٹنے کے لئے کافی ہے۔ انہیں چھپر والوں سے کہیں زیادہ آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''بحث مت کرو، سر پر موت کھڑی ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ سوچو کہ چھپر کو آگ کیسے لگائی جائے؟'' زمیں بیگم نے ایک بار پھر ان سب کو خاموش کر کے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ بڑے بیٹے نے فکر مندی کے انداز میں کہا۔ ''چھت پر سے مسلسل فائرنگ ہو رہی ہے۔ دالان کا دروازہ کھول کر جو بھی صحن پار کرے گا، ڈاکوؤں کی گولیوں کا نشانہ بن جائے گا۔''

زمیں بیگم کا پورا کنبہ پریشان تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ چھپر تک کیسے پہنچا جائے اور آگ کیسے لگائی جائے۔ سب کو خاموش دیکھ کر ایک چھوٹے بچے نے اماں سے کہا۔ ''اماں، ماچس مجھے دو، میں چھپر میں آگ لگاتا ہوں۔'' یہ سن کر زمیں بیگم کے ہاتھ میں دبی ہوئی دیا سلائی پر پکڑ اور مضبوط ہو گئی۔

''اپنے ہی گھر میں آگ لگانا کہاں کی دانشمندی ہے؟'' چھوٹے بیٹے نے بھرائی ہوئی آواز میں ایک بار پھر سوال کیا۔ اس پر بڑے بیٹے نے اسے ڈانٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم اپنے گھر کو آگ نہیں لگا رہے ہیں۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی جانیں بچانا چاہتے ہیں۔ یوں بھی اگر ہم اس آگ میں جل بھی گئے، جل کر مر بھی گئے، تب بھی ہم اپنی آنے والی نسلوں کو بچانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔''

''تم لوگ خاموش رہو۔ جیسے ہی چھپر میں آگ لگے، تم سب مل کر اپنی پوری قوت کے ساتھ نعرہ لگانا کہ ''گاؤں والو دوڑو! آگ لگ گئی ہے۔'' زمیں بیگم نے کہا۔ دالان کا دروازہ کھولا اور چیتے کی مانند صحن میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی دنادن کئی فائر ہوئے۔ اچانک چھپر کے نیچے چمک پیدا ہوئی اور پھونس کا چھپر پلک جھپکتے ہی دھو دھو کر جلنے لگا۔ یہ دیکھ کر سرنگ نما گھر میں قید زمیں بیگم کے کنبہ نے اپنی پوری قوت کے ساتھ شور مچایا۔ ''گاؤں والو دوڑو! آگ لگ گئی۔'' دیکھتے ہی دیکھتے پورا گاؤں آگ بجھانے کے لئے زمیں بیگم کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

آگ لگتے ہی چاروں طرف روشنی ہوگئی۔ روشنی ہوتے ہی چھت پر کھڑے ڈاکو یا ڈاکونما جو کہ مسلسل فائرنگ کر رہے تھے، غائب ہو گئے۔ پورا گاؤں مستعدی کے ساتھ آگ بجھانے میں مصروف ہو گیا۔ جن کے پھونس کے چھپر تھے، وہ اپنے چھپروں پر پانی ڈال ڈال کر گیلا کرنے لگے تا کہ چھپر آگ نہ پکڑیں۔ جن لوگوں کے پختہ مکان تھے، انہوں نے فوراً ہی اپنے دروازے کھول دیئے تھے تا کہ لوگ ان کے نلوں سے پانی بھر سکیں۔ وہ خود بھی بالٹیاں بھر بھر کر لوگوں کو مہیا کرا رہے تھے۔ جس سے آگ پر جلد سے جلد قابو پایا جا سکے۔

کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد گاؤں والوں نے آگ پر قابو پالیا۔ آگ بجھتی دیکھ کر زمیں بیگم کے کنبہ اور گاؤں والوں کو زمیں بیگم کا خیال آیا۔ انہیں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی بھینس کو بچانے کے چکر میں جھلس گئی ہیں۔ سب لوگ ان کے لئے فکر مند ہو گئے۔ انہیں جلد سے جلد سرکاری ہسپتال لے جانے کے لئے آناً فاناً میں بیل گاڑی کا بندوبست کیا گیا۔ اماں درد سے بُری طرح کراہ رہی تھیں...... ہسپتال لے جانے کے لئے جب ان کو بیل گاڑی میں لٹایا گیا تو رات تین پہر بیت چکی تھی اور صبح کاذب نمودار ہونے کو تھی۔ ○○

ڈار بریدہ

دسمبر کے آخری ہفتہ کی یخ بستہ رات کے تقریباً ساڑھے دس بجے تھے۔ نئی اور پُرانی دہلی کی درمیانی شاہراہ سنسان اور ویران تھی...... آس پاس کی ہر شئے ٹھٹھری ہوئی سی لگ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے بنے مکان اور درخت دھندلی روشنی میں سکڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے...... ساری فضا میں بدمزگی کی سی کیفیت تھی۔ فقط تیز اور سرد ہوا تھی جو اپنی موجودگی منوانے کے لئے بیقرار تھی۔

ہم لوگ رام لیلا میدان کے آخری سرے پر کھڑے تھے۔ یہیں ہماری بس کھڑی تھی جس میں سوار ہو کر ہم لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کو جانا تھا۔ سب لوگ آچکے تھے۔ ثمرین اور اس کی دس سالہ بیٹی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ان دونوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ دراصل ہم لوگ بَری کا کھانا کھا کر لوٹ رہے تھے اور اگلے دن شادی تھی۔ ہمارے معدے قورمہ، کباب، بریانی اور فیرنی سے بھرے ہوئے تھے۔ ہوا بہت سرد تھی اس لئے سب لوگوں کو لحاف کی گرماہٹ یاد آرہی تھی۔ ایسے میں کسی کا انتظار عذاب سے کم نہ تھا۔ ثمرین کا شوہر ضیاء الرب خاں عقاب پنجہ، لحیم شحیم آدمی تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے ثمرین کو تلاش کر رہا تھا۔ کبھی اس گلی میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جاتا، کبھی اس گلی میں۔ آہستہ آہستہ سارے مرد بس سے اتر آئے اور ثمرین ان کا موضوعِ گفتگو بن گئی۔ صرف عورتیں بس میں بیٹھی رہ گئیں۔ میں نے سگریٹ سلگا کر دو چار لمبے لمبے کش لئے اور دھواں خلا میں چھوڑ

دیا جو کہ دور تک منجمد ہوتا چلا گیا۔ ایک عزیز میرے قریب آئے اور بولے......

''میاں ایک سگریٹ تو دو......''

میں نے سگریٹ کا پیکٹ ان کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے ایک سگریٹ سلگایا اور دھواں خلا میں چھوڑتے ہوئے میرے کچھ اور قریب آئے اور معنی خیز انداز میں بولے...... ''آج نکل گئی وہ......'' میں نے استفسار کیا کہ کون نکل گئی؟ فرمانے لگے......

''ثمرین اور کون...... معلوم نہیں اس کا اصل نام کیا ہے۔ آج اس کو موقع مل گیا۔ ساتھ میں اپنی دس سال کی بیٹی کو بھی لے گئی۔ وہ بڑھاپے کا سہارا بنے گی نا۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میں نے کچھ غصے اور کچھ حیرت سے کہا تو کہنے لگے۔

''تمہیں شاید معلوم نہیں یہ ہندو ہے۔ ثمرین اس کا اصل نام نہیں۔ یہ نام تو ضیاالرب کی ماں نے مجبوری میں رکھا ہے۔ بیٹا اگر واہیات ہو تو ماں باپ بھی کیا کریں؟ رشتہ داروں اور سماج کو بیوقوف بنانے کے لئے کہہ دیا کہ یہ تو مسلمان ہو گئی ہے اور اب اس کا نام ثمرین ہے۔ آج پنجرہ کھلا دیکھ چڑیا پُھر ہو گئی۔''

''تم یہ بیوقوفی کی باتیں کیوں کر رہے ہو۔'' میں نے ان سے کہنا شروع کیا۔

''ثمرین کی دس سال کی پیاری سی بیٹی ہے۔ تقریباً سات آٹھ سال کا خوبصورت بیٹا ہے جو کہ اس وقت بس میں ہمارے ساتھ ہے۔ یعنی اس کی شادی کو بارہ سال کے آس پاس ہو چکے ہیں۔ اگر اسے جانا ہی ہوتا تو کب کی چلی گئی ہوتی۔ اپنے بیٹے اور شوہر کو چھوڑ کر اب وہ بھلا کیوں جائے گی۔ جبکہ اس کے ماں باپ نے بھی اسے ترک کر دیا ہو تو کیوں کر جائے گی۔ اگر راہی ایک بار راستہ بھول جائے تو ضروری نہیں کہ بار بار بھولے۔ زندگی کے خاردار راستے بڑے بڑے خودسر کو سیدھے راستے پر چلنا سکھا دیتے ہیں۔ ہم لوگوں کو ثمرین پر بھروسہ رکھنا چاہئے، وہ ضرور آئے گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ اسے تلاش کرنے میں ہم ضیاالرب خاں کی مدد کریں۔''

میری باتیں سن کر وہ کہنے لگے۔ ''بس میاں! بھول جاؤ کہ وہ واپس آئے گی۔ اس سرد رات میں ہم لوگ بے وجہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اچھا تو یہ ہوگا

کہ ہم ضیاالرب خاں کو بھی یہیں چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلیں۔" ایک اور صاحب جو پاس ہی میں کھڑے ہم دونوں کی باتیں سن رہے تھے، ٹھنڈ سے کانپتے ہوئے اور دانت کٹکٹاتے ہوئے کہنے لگے......

"اتنے لوگوں میں اس کمینی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں بھولا۔ کیا وہ دودھ پیتی بچی ہے جو راستہ بھول گئی اور ہم یہاں ٹھنڈ میں مر رہے ہیں۔" ابھی ان کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ سامنے والی شاہ راہ پر گہری دھند میں دو سائے ہلتے ہوئے نظر آئے۔ کچھ لمحوں کے بعد جوتوں کی کھڑ کھڑ کی آواز بھی آنے لگی۔ سب لوگ، جو کہ ثمرین اور اس کی بیٹی کا انتظار کر رہے تھے، جوتوں کی آواز کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ سائے صاف نظر آنے لگے۔

ثمرین اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑے ہوئے بدحواسی کے عالم میں ہم لوگوں کی طرف آ رہی تھی۔ پاس آ کر اس نے سب لوگوں کو اپنا منتظر پایا جو کہ مشکوک نگاہوں اور غصے سے اُسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اس نے جلدی جلدی کچھ کہنا شروع کیا۔ بوکھلاہٹ میں اس کے کہنے کی اسپیڈ اتنی تھی کہ الفاظ اور جملے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"میں پتلی گلی میں داخل ہو گئی اور بے ارادہ چلتی رہی کہ گلی جہاں ختم ہوگی، سامنے ہی بس کھڑی ہوگی۔ لیکن بہت دیر تک چلتے رہنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں غلط راستے پر نکل آئی ہوں۔" ثمرین کی بات کو بیچ میں کاٹتے ہوئے ضیاالرب خاں نے غیض و غضب کے عالم میں تقریباً دہاڑتے ہوئے کہا......"بس میں بیٹھو۔"

جلدی جلدی سب لوگ بس میں سوار ہو گئے۔ ضیاالرب نے ایک نگاہ بس میں سوار لوگوں پر ڈالی اور بس کی بوڈی پر اتنا زوردار ہاتھ مارا کہ بس لرز گئی۔ یہ ڈرائیور کو اشارہ تھا کہ وہ بس چلائے۔

میں اپنی بیوی کے ساتھ ثمرین کی برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور ثمرین کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ زوردار ٹھنڈ کے باوجود وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی، شال اور جرسی اُتار

کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ خوفزدگی اور گھبراہٹ کا عالم یہ تھا کہ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کے رخساروں اور گردن سے ہو کر اس کی تند خو چھاتیوں کی درمیانی نہر سے ہو کر بہہ رہی تھیں۔

میری آنکھیں اس کے سراپے میں گھسی ہوئی تھیں۔ میں اس کی سوچ تک پہنچنا چاہتا تھا کہ اس وقت اور ان حالات میں اس کے دماغ میں کس طرح کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ اس کے چہرے کے نمایاں تغیرات سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس کے دماغ میں خیالات کا ایک ہجوم ہے۔ اس کی افسردگی میرے لئے بے حد اذیت رساں تھی۔ عین اسی وقت جب میں ثمرین کے دماغ کو پڑھنے کی کوشش میں گم تھا، میری بیوی نے اپنی کہنی میری پسلی میں اس سختی سے اڑائی کہ میں بلبلا کر سیدھا ہو گیا اور بیوی کو گھورنے لگا۔ بیوی نے آہستہ سے لیکن ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔

''میرا بس چلے تو اسی وقت تمہاری آنکھوں میں مرچیں جھونک دوں۔ اس قدر نیک اور شریف عورت کو تم انتہائی کمینگی سے تک رہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہئے۔ ثمرین بہت ہی نیک اور بھولی ہے۔ ضیاالرب جیسے لٹھ کو ہنسی خوشی بھر رہی ہے۔ جبکہ اس اُجڈ کو توٹٹ فارٹیٹ قسم کی عورت ملنی چاہئے تھی۔''

تھوڑے توقف کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''ثمرین جس وقت قرآن شریف پڑھ کر دعا مانگتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے خدا کی رحمتوں کی بارش ہو رہی ہو اور سارا ماحول نورانی ہو گیا ہو۔ آپ اس کو گھٹیا پن سے دیکھ رہے ہیں...... بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیا کروں...... میری ہی قسمت خراب ہے جو تمہارے جیسا خانہ خراب میری قسمت میں لکھا ہے۔ اب چپ چاپ سیدھے بیٹھے رہو اور سامنے دیکھتے رہو۔ خبردار! جواب ثمرین پر نظر ڈالی تو...... پتہ نہیں گھر جا کر یہ اُجڈ ضیاالرب اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔''

میں نے ایک نظر بیوی کو دیکھا اور پھر ثمرین کے بارے میں سوچنے لگا کہ

میری بیوی کو اس کی شرافت، اس کا قرآن شریف پڑھنا، دعائیں مانگنا تو اچھا لگتا ہے، لیکن وہ یکسر یہ بھول گئی کہ ثمرین کا ماضی بھی تھا۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی، بچپن کی سہیلیاں اور جانے کیا کیا ہوگا جیسا کہ ہر شخص کے ماضی میں ہوتا ہے۔ وہ یکلخت سب کچھ چھوڑ کر آ گئی۔ ایک پورے سماج سے کٹ کر اپنے ریتی رواج اور سنسکاروں سے کٹ کر ایک دم دوسرے سماج میں، جس کی ساری رسومات اور دوسری چیزیں اُسے شعوری طور پر یا مجبوری میں قبول کرنی پڑ رہی ہوں گی۔ جیسے رائے بیل کو چمپا، چمیلی اور مونگرا کے بیچ میں سے اکھاڑ کر کیاری کی بجائے بنجر زمین میں کیکر کے پاس لگا دیا گیا ہو کہ جب بھی تیز ہوا چلے، کیکر کے بے حس و بے رحم کانٹے اس کے پھولوں اور پتیوں کو چیر پھاڑ کے رکھ دیں اور ہوا میں اِدھر اُدھر اڑنے کے لئے مجبور کر دیں۔ زندگی کے گیارہ بارہ سال ضیاالرب خاں کے ساتھ کاٹنے کے بعد اور دو بچوں کو جنم دینے کے بعد بھی نامعتبر۔

جب بھی وہ بابل کے گیت سنتی ہوگی تو اس پر کیا گزرتی ہوگی...... وہ اپنا دکھ کسی سے کہہ بھی نہ پاتی ہوگی۔

''گھر آ گیا۔'' میری بیوی نے مجھے ٹہوکا دیا تو میری سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ''جلدی چلو اور سو جاؤ۔ صبح کو شادی میں جانا ہے۔ لہٰذا جلدی اٹھنا ہے۔'' بیوی نے ہدایت دی۔

رات بھر میں چین سے سو نہ سکا۔ جسم اگر سو بھی گیا تو دماغ جاگتا رہا اور ٹوٹے ٹوٹے خوفناک خواب دیکھتا رہا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو ذہن میں ثمرین ہی کا خیال تھا کہ اس کی رات کیسے کٹی ہوگی۔ ضیاالرب خاں نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہوگا...... کہ ایک بار پھر بیوی نے یاد دلایا کہ ہمیں جلد تیار ہو کے دولہا کے گھر پہنچنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ باراتیوں کو ہمارا انتظار کرنا پڑے۔ لہٰذا ہم لوگ تیار ہو کر دولہا کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں لڑکے کو نوشہ بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں لان میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا...... سگریٹ سلگایا اور آرام سے لمبے

لمبے کش لینے لگا۔ دھوپ میں تیزی تھی کہ سورج پوری طرح چمک رہا تھا لیکن سرد ہوا کے جھونکے بھی سرسرا رہے تھے اور پوس مہینے کے خاتمے اور ماگھ کی آمد کا احساس دلا رہے تھے۔ لان کے آس پاس آم، شیشم اور کچھ دوسرے بے ثمر درخت بھی کھڑے تھے...... جن کی شاخوں سے چھن کر ہوا کا بعض سرد جھونکا سیدھا سینے پر حملہ کرتا تھا۔

ابھی میں نے سگریٹ ختم بھی نہ کیا تھا کہ سامنے والی سڑک سے ثمرین، ضیاالرب خاں اور ان کے دونوں بچے آتے دکھائی دئے۔ نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ضیاالرب خاں اور گہرے عنابی رنگ کی ساڑی میں ثمرین ایک دوسرے کو برابر کی ٹکر دے رہے تھے۔ اپنے قد کاٹھی، حلیئے اور جثہ کے اعتبار سے دونوں ہی شاندار لگ رہے تھے۔ عام حالات میں ابولہول قسم کا دکھائی دینے والا ضیاالرب خاں اس وقت وجیہہ شخص نظر آ رہا تھا۔ چھ فٹ کی لمبائی والے ضیاالرب خاں کے ساتھ تقریباً پانچ فٹ نو یا دس انچ کی ہائٹ کی ثمرین ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنے شوہر کے قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھ رہی تھی۔ اس وقت وہ دنیا کے شاندار جوڑوں میں سے ایک جوڑا معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے کئی بار آنکھیں جھپکا جھپکا کر ان دونوں کو دیکھا اور دل ہی دل میں عش عش کیا۔ آداب وسلام کے بعد دونوں میری برابر والی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے ایک نظر ثمرین کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تشدد کے آثار نہ تھے۔ وہ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔

لان میں بیٹھے مہمانوں میں کچھ بے ترتیبی ہوئی اور ایک بڑی کرسی لان کے بیچ میں لا کر رکھی گئی۔ معلوم ہوا کہ نوشہ سازی کی تیاری ہے۔ کچھ لمحوں بعد شیروانی اور چھوٹی مہری کا پائجامہ پہنے دولہا اس مخصوص کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دولہا کی بہن پھولوں کا سہرا لے کر آ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں کلمہ خیر پڑھا اور سہرا سہاگنوں کے ماتھے کو لگانا شروع کر دیا۔ رسم کے مطابق سہرا سات سہاگنوں کے ماتھے کو لگایا جاتا ہے۔ یعنی چھ موجود سہاگنیں اور ساتویں آنے والی۔ سب سے پہلے دولہے کی بہن نے اپنے ماتھے پر سہرا لگایا۔ اس کے بعد میری بیوی کے، پھر چچی

اور اپنی بھابھی کے، پانچ کے ماتھے پر لگانے کے بعد چھٹی سہاگن کے ماتھے پر سہرا لگانے کے لئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پاس ہی میں ثمرین بیٹھی ہوئی تھی جو کہ بلاشک وشبہ ایک شاندار سہاگن تھی۔ پھولوں کا سہرا لے کر وہ ثمرین کی طرف بڑھی۔ ثمرین بھی اپنی کرسی سے کچھ اوپر اُٹھی اور آگے بڑھی۔ جیسے وہ اپنا ماتھا سہرے کی پہنچ میں دینا چاہتی ہو کہ دولہا کی بہن نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنا ہاتھ اونچا کیا اور ثمرین کے پیچھے کھڑے ہوئے دادا دادی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دادی کے ماتھے سے سہرا لگا دیا۔ ثمرین نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی کرسی میں سمٹ گئی۔ اسی وقت ایک تیز سرد ہوا کا جھونکا آیا اور پیڑوں کے سوکھے ہوئے پتے شاخوں سے ٹوٹ کر ہوا میں لہرائے۔ کچھ ثمرین کے دامن میں آ کر گرے اور کچھ دور تک اڑتے چلے گئے۔

OO

سفر کہانی

احمد آباد کے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک نظر میں نے سامنے دیکھا۔ سب کچھ حسبِ معمول تھا...... بسیں، آٹو رکشا، اسکوٹر، موٹر سائیکل، کاریں اور پیدل چلنے والوں کی بھیڑ...... میرے لئے احمد آباد دیکھا بھالا شہر تھا۔ سڑکیں، گلیاں، ہوٹل اور سنیما گھر سب جانے پہچانے۔ متعدد مرتبہ میں یہاں آچکا تھا۔ لیکن اس بار جب میں اسٹیشن سے باہر آیا تو بے وجہ ہی میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ گو کہ گرمی کچھ خاص نہ تھی پھر بھی میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ سوٹ کیس زمین پر رکھ کر میں نے ایک آٹو رکشا والے کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ آٹو رکشا میرے پاس آتا، ایک پولیس والا کندھے پر رائفل رکھے ہوئے میرے پاس سے گزرا۔ میں اسے دیکھ کر کچھ اس طرح اپنی جگہ سے ہٹا جیسے کوئی درندہ میرے پاس سے گزرا ہو۔ آٹو رکشا میں سوار ہوتے وقت میں نے آٹو والے کو غور سے دیکھا...... اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایک نظر سامنے کی پلیٹ کو بھی دیکھا جہاں اکثر آٹو رکشا میں ۷۸۶، رام یا عیسیٰ کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ لیکن اس آٹو میں ایسا کچھ نہ تھا۔ آٹو والا مجھے نسبتاً شریف آدمی معلوم ہوا۔ اس نے آٹو اسٹارٹ کیا اور بولا۔ ''صاحب، کدھر جانے کا ہے؟''

''ریلیف روڈ، ہوٹل راجن۔'' میں نے جواب دیا۔

فاصلہ کچھ خاص نہ تھا لہٰذا جلدی ہی ہم ہوٹل راجن پہنچ گئے۔ میں نے اپنا

سوٹ کیس اُٹھایا، آٹو والے کو پیسے دیئے اور ہوٹل کے Reception پر پہنچ گیا۔
Reception Clerk نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا روم مانگتا کیا سر؟''
میں نے "Yes" کہا تو کلرک نے جواب دیا۔
''سوری سر، روم Vaccant نہیں ہے۔''
''میں آپ کا بہت پُرانا Customer ہوں۔ میں جب بھی احمد آباد آتا ہوں، آپ ہی کے ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ آپ مجھے Adjust کیجئے۔ کچھ گنجائش نکالئے جناب۔''
''وہ تو ٹھیک ہے سر، لیکن ابھی کوئی روم خالی نہیں ہے۔ یہاں بازو میں کئی ہوٹل ہیں۔ آپ وہاں معلوم کیجئے، وہاں آپ کو روم مل جائے گا۔''
میں نے مجبوراً اپنا سوٹ کیس اُٹھایا اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد میری نظر ہوٹل گرین پیلیس پر پڑی۔ ہوٹل نیا بنا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں اس کے Reception پر پہنچ گیا۔ Reception Clerk سے میں نے کہا۔
''ایک روم چاہئے۔''
''آپ اکیلے ہی ہیں یا کوئی اور بھی آپ کے ساتھ ہے؟'' کلرک نے پوچھا۔
میں نے کہا۔ ''میں اکیلا ہی ہوں۔''
اس نے بہت وزنی رجسٹر دراز سے نکالا اور کاؤنٹر پر رکھ دیا جو کہ مسافروں کی Entry کا رجسٹر تھا۔ میں نے جیب سے نظر کا چشمہ نکالا، آنکھوں پر لگایا اور رجسٹر میں اپنی آمد کا اندراج کرنے لگا۔ پہلے خانے میں، مسافر کا نام و پورا پتہ، اس کے بعد باپ کا نام، پھر کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ Nationality کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ...... اتنے خانے تھے کہ مجھے حیرت ہوئی۔ جب میں اپنا نام و پتہ لکھ چکا تو Reception Clerk نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔
''آپ پہلے کالم کو ہی پوری طرح بھر دیجئے، باقی میں خود بھر لوں گا...... اور یہ

ایڈوانس کی رسید لیجیے۔'' ایڈوانس کی رسید میں نے پکڑی اور کلرک سے کہا۔
''پہلا کالم تو میں بھر چکا ہوں۔''
''نہیں صاحب، آپ نے W. M. Chaudhary لکھا نا، تو W.M. سے کیا بنتا ہے، یہ پورا لکھیے۔''
''کمال ہے...... میرا نام W.M. ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ W.M. کی فل فارم بھی لکھی جائے۔''
''فرق پڑتا ہے صاحب...... Specially احمد آباد میں تو بہت فرق پڑتا ہے۔''
''میں احمد آباد آتا رہتا ہوں اور راجن ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ راجن ہوٹل کے علاوہ بھی کئی بار دوسرے ہوٹلوں میں ٹھہرا ہوں، لیکن مجھ سے کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ W.M. سے کیا بنتا ہے؟ اس کی فل فارم لکھیے۔''
''بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے صاحب۔ آپ یا تو پورا نام لکھیے یا پھر کسی اور ہوٹل میں چلے جائیے۔'' کلرک نے قطعیت کے ساتھ روکھے پن سے کہا تو میں بغلیں جھانکنے لگا اور احمقوں کی طرح اسے گھورنے لگا...... کلرک کے سر کے اوپر، تقریباً دیوار کے بیچ میں بہت ہی باریک اور سنہرے لفظوں میں لکھی اور سنہرے فریم میں جڑی مجھے ایک قرآنی آیت نظر آئی تو مجھے لگا کہ یہ مسلم ہوٹل ہے۔ لہٰذا میں نے مسافروں کے اندراج والا رجسٹر اپنی طرف کھینچا اور W.M. کی جگہ ولی محمد لکھ دیا...... کلرک نے ایک نظر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور رجسٹر کے باقی کالم بھرنے کے بعد کہنے لگا۔
''ولی محمد بھائی، آپ کچھ خیال مت کیجیے گا۔ دراصل یہاں کی پولیس بہت حرامی ہے۔ آئے دن سالے بے وجہ ہوٹل کی چیکنگ کو آتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے رجسٹر ہی دیکھتے ہیں...... چونکہ یہ مسلم ہوٹل ہے، اس لئے بھی پولیس والے اکثر بے وجہ چیکنگ کو آجاتے ہیں اور تنگ کرتے ہیں۔ یہاں کی پولیس بہت متعصب

اور زہریلی ہے۔ خدا انہیں غارت کر دے۔''

کلرک کی باتیں سن کر میں نے اس سے پوچھا۔ ''جناب آپ کا نام کیا ہے؟''

''میں اکبر علی احمد علی لوکھن والا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یعنی آپ اکبر بھائی ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''ایسا ہے اکبر بھائی...... ہمیں ان کا تعصب، ان کا زہر اور ان کا کمینہ پن تو آسانی سے نظر آجاتا ہے۔ لیکن ہم اپنا احتساب کبھی نہیں کرتے۔ یعنی ہمیں اپنا زہر کبھی نظر نہیں آتا۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اکبر نے پہلو بدل کر بے چینی سے پوچھا تو میں نے کہنا شروع کیا۔

''آپ اپنے ہی کو دیکھئے...... بے ڈھنگی داڑھی، خوفناک مونچھیں، بے ترتیب بال، ملگجئے کے رنگ کی شلوار قمیص...... خدانہ خواستہ آپ کے کندھے پر A.K.47 اور رکھ دی جائے تو ایسا لگے گا جیسے آپ ابھی ابھی درۂ خیبر پار کر کے آئے ہیں...... جبکہ اکبر بھائی، داڑھی مدبرانہ متانت کی علامت تھی، لیکن ہم لوگوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اسلام کی روح کو سمجھا ہی نہیں۔ آج مسلمان ہندوؤں سے خوفزدہ ہیں تو ہندو مسلمانوں کی بنیاد پرستی سے، اور بدنصیبی یہ ہے کہ دونوں طرف احیاء پرست سیاسی اور مذہبی رہنما بنے ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہندو اور مسلمانوں کے بیچ کھائی گہری ہوتی جا رہی ہے اور مکالمہ صفر ہوتا جا رہا ہے۔''

''اے کانیا...... صاحب کا سامان روم نمبر ۲۰۲ میں لے جا کر رکھ...... جاؤ صاحب، کسی چیز کی ضرورت ہو تو نوکر کو بتا دینا۔''

نوکر میرا سوٹ کیس اور کمرے کی چابی لے کر چل دیا۔ شاید اکبر بھائی کو میری باتیں ناگوار لگیں، میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور نوکر کے پیچھے پیچھے اپنے روم کی

طرف چل دیا۔

روم میں پہنچ کر میں نہایا، کپڑے بدلے اور گرم گرم چائے پینے بیٹھ گیا۔ سفر کی جسمانی اور ذہنی تھکن دور ہوئی تو سوچا کہ Patel & Sons سے مل کر یقیناً تازگی کا احساس ہوگا، کہ پٹیل اینڈ سنس کے مالک شمبھو بھائی سے میرے بہت شاندار تعلقات ہیں اور ہم دونوں کے درمیان پرانا کاروباری رشتہ بھی ہے۔ لہٰذا میں ہوٹل سے باہر آیا، آٹو رکشا پکڑا اور پٹیل اینڈ سنس کے یہاں پہنچ گیا۔ شمبھو بھائی اپنی کرسی پر بیٹھے کچھ کاغذات الٹ پلٹ رہے تھے۔ میں نے ان کو آداب کیا تو انہوں نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے تپاک سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیکن شمبھو بھائی نے سرد مہری...... بلکہ کسی قدر بے اعتنائی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میری آمد پر ذرا بھی خوشی کا اظہار نہ کیا۔ ہاتھ ملا کر وہ پھر اپنے کاغذات دیکھنے لگے۔ مجھ سے بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔ میں اسی طرح کھڑا رہا اور سوچنے لگا کہ آخر کیا بات ہے؟ کیا شمبھو بھائی مجھ سے ناراض ہیں؟ لیکن کیوں؟ کچھ دیر کے بعد شمبھو بھائی نے اپنا سر اوپر کیا اور بولے۔ ''بیٹھو...... اس وقت ہمارا اسٹاک فل ہے۔ ہمیں کسی Item کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی اب آپ کے یہاں شنکر انڈسٹریز کے نام سے ایک صاحب نے نئی فرم کھولی ہے۔ وہ یہاں آئے تھے۔ اُن کا پروڈکٹ بھی آپ کے جیسا ہی ہے۔ لہٰذا میں نے ان کو بلک آرڈر دے دیا ہے۔ یوں بھی ہم نئے آنے والوں کو Cooprate کرتے ہیں، یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ احمد آباد میں آپ کا پروڈکٹ بکنے کے Chances بہت کم ہیں۔ اچھا تو یہ ہے کہ اب آپ کوئی دوسرا مارکیٹ تلاش کرلیں، جیسے کشمیر وغیرہ۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شمبھو بھائی؟ میرے اور آپ کے بہت پُرانے Relations ہیں اور میرا پروڈکٹ بھی نیا نہیں بہت پُرانا ہے۔ آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''ایسا ہے ولی بھائی، مارکیٹ میں پروڈکٹ تو وہ بکے گا جسے ہم بیچیں گے......

کیا نیا اور کیا پُرانا...... ! چائے پانی کچھ پئیں گے آپ؟"

"جی نہیں، شکریہ۔"

"ٹھیک ہے، پھر آیئے گا...... ویسے میری رائے ہے کہ فی الحال آپ گجرات میں کاروبار کرنے کا ارادہ چھوڑ دیں تو اچھا ہے۔"

یہ کہہ کر شمبھو بھائی ٹیبل پر رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے لگے۔ ان کے رویّے سے مجھے سخت مایوسی اور افسوس ہوا۔ میرے پیر من من بھر کے ہو گئے، ندامت اور شرمندگی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے میں ان کی دکان سے باہر آیا تو سورج کی تیز شعاعیں میرے وجود میں گھستی چلی گئیں اور یہ تمازت مجھے قدرے اچھی لگی۔ میں نڈھال نڈھال سا کچھ دیر یوں ہی تیز دھوپ میں چلتا رہا......

انسان اپنے مفادات اور منافع کے لئے بے حد کمینہ ہوتا ہے۔ میں شمبھو بھائی کے یہاں ذلیل ہونے کے بعد بھی بے ارادہ چلتا ہوا گجرات کوآپریٹیو اسٹور کی شاندار عمارت تک پہنچ گیا۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا کہ جو تذلیل پٹیل اینڈ سنس کے یہاں ہوئی، وہ گجرات کوآپریٹیو اسٹور میں نہ ہو۔ عمارت میں داخل ہو کر میں سیدھا منیجر جینتی بھائی کے کمرے میں پہنچا۔ لیکن وہاں منیجر کی کرسی پر جینتی بھائی کی جگہ کوئی سریش بی پٹیل بیٹھا تھا۔ مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر اس نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سو کام چھے؟"

"جینتی بھائی سے ملنا تھا۔" میں نے کہا۔

"جینتی بھائی تو ریٹائر ہو گیا۔ کوئی اور کام ہو تو بولو۔"

میں نے اپنی کمپنی کا وزیٹنگ کارڈ، جس پر میرا نام پرنٹ نہیں تھا، جیب سے نکالا اور سریش بی پٹیل کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کارڈ پڑھا اور بولا۔

"بیٹھو۔"

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میری کمپنی کے وزیٹنگ کارڈ

کو غور سے پڑھا۔ میرے اوپر ایک بھرپور نظر ڈالی اور کہنے لگا۔

''آپ کی کمپنی کا پروڈکٹ تو ابھی ہمارے اسٹاک میں ہے...... چائے پانی کچھ پئیں گے آپ؟''

''جی نہیں، دھنیہ واد!''

اس نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

میں اس کے اس سوال پر گھبرا گیا۔ شاید میں اس کے لئے تیار نہ تھا اور حونقوں کی طرح منیجر کے دفتر کو غور سے دیکھنے لگا۔ میں شاید اُس کے اِس سوال کو کہ ''میرا نام کیا ہے؟'' ٹالنا چاہتا تھا...... یا اگر نام بتانا ہی پڑے تو کیا بتاؤں؟ سچ یا جھوٹ؟ میں اسی کشمکش میں تھا کہ منیجر نے ایک بار پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے پوچھا مسٹر...... آپ کا نام کیا ہے؟''

''جی...... جی...... میرا نام...... اے۔ پی۔ سنگھ ہے۔''

''اچھا...... ویری گڈ...... آپ کے پتاجی کا نام کیا ہے؟''

''این۔ پی۔ سنگھ۔'' میں نے کہا۔

''اچھا مسٹر سنگھ، یہ بتایئے کہ آپ کا گوتر کیا ہے؟''

''راٹھور۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، تو آپ راٹھور ہیں۔ آپ سے مل کر اچھا لگا۔'' یہ کہہ کر اس نے گرمجوشی سے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور نوکر کو آواز دی۔

''اے بابو بھائی...... باہر گاؤں سے ویاپاری آیو چھے...... تمیں خبر نہ تھی...... بے گلاس پانی آپو نے باشاہی۔'' ملازم کو ہدایت دے کر سریش بی پٹیل نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔

''راٹھور صاحب، آپ کا پروڈکٹ تو ہمارے اسٹاک میں ہے، لیکن کوئی بات نہیں۔ آپ اتنی دور سے آئے ہیں تو آپ کا مان تو رکھنا ہی پڑے گا۔ ویسے بھی

پٹیل اور راٹھور ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ آپ آرڈر فارم نکالئے اور ہمارا آرڈر لکھئے، اور جتنا آپ کا دل چاہے اتنا لکھیے، اور جلد سے جلد مال بھیجئے۔ اگر کوئی تکلیف ہو، یعنی مال سپلائی کرنے میں آپ کو کوئی Difficulty ہو تو بتایئے۔''

''نہیں پٹیل صاحب، کوئی Difficulty نہیں ہے، اور ویسے بھی جب آپ کا Best Coopration ہمارے ساتھ ہے تو پھر کوئی مشکل ہو ہی نہیں سکتی۔''

''ٹھیک ہے راٹھور صاحب، مال آپ جلدی بھیجیں۔''

میں نے اپنی چائے ختم کی، حسبِ دل خواہ گجرات کوآپریٹیو اسٹور کا آرڈر لکھا، آرڈر فارم پر سرلیش بی۔ پٹیل کے دستخط کرائے، شکریہ ادا کیا اور اسٹور کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی ایک بار پھر سورج کی تیز شعاعیں میرے وجود میں گھستی چلی گئیں اور میں اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کرتا ہوا تیز دھوپ میں چلتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا جھوٹ بول کر کاروبار کرنا مناسب ہے؟ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آخر میں نے اپنی پہچان کیوں چھپائی؟ اسی طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں میں کافی دور تک پیدل چلتا رہا...... دھوپ کی تمازت سے میرا سر چکرانے لگا اور جوتوں کے اندر پیروں میں سے آگ نکلنے لگی۔ تب میں نے آٹو رکشا روکا، اس میں بیٹھا اور اپنے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ہوٹل پہنچ کر میں کچھ دیر تک اپنے کمرے کو خالی خالی نظروں سے پنجرے میں قید پرندے کی طرح دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں احمد آباد آیا ہی کیوں؟ مجھے احمد آباد آنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ اِن ہی خیالات کے درمیان مجھے دھن سکھ سیٹھ کی یاد آئی۔ دھن سکھ سیٹھ سورت میں ''کویتا لوج'' کے نام سے ایک چھوٹا سا لوج اور ریسٹورینٹ چلاتے تھے۔ میری جوانی کے دو اہم سال ان کے Lodge میں ان کے ساتھ گزرے تھے۔ میں ان دنوں مراد آباد کے پیتل کے برتنوں کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ فی الحال گجرات میں کاروبار کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا جائے اور دھن سکھ سیٹھ کے پاس چلا جائے، ماضی کی یادوں کو تازہ کیا جائے اور دو چار دن ان کے ساتھ گزار کر گھر کو واپس ہولیا جائے۔

یہ سوچ کر کہ دھن سکھ سیٹھ سے ملاقات ہوگی، مجھے خوشی ہوئی اور خیال آیا کہ سارے دن سے کچھ کھایا ہی نہیں۔ زوردار بھوک لگ رہی تھی۔ چونکہ بھوک سب طرح کے خیالات پر حاوی ہو جاتی ہے، لہٰذا میں دن بھر کی کدورت بھول کر کالو پور ٹاور کے پاس بھننے والے مٹن، چکن اور فش فرائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ یوں بھی گجرات کوآپریٹیو اسٹور سے شاندار آرڈر ملا تھا...... منافع تو بہرحال منافع ہی ہوتا ہے، چاہے اس میں کتنی ہی اخلاقی گراوٹ کیوں نہ ہو۔ لہٰذا میں نا چاہتے ہوئے بھی اپنے اندرون کے کسی نہ کسی کونے میں خوش ضرور تھا...... اور اگر انسان اندرون کے کسی نامعلوم کونے میں بھی خوش ہے تو اس کا کچھ نہ کچھ عیاشی کرنے کو دل ضرور چاہتا ہے۔ خواہ وہ لذیذ کھانوں کی لمحاتی عیاشی ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا میں ایک ادائے خاص سے کالو پور ٹاور پہنچ گیا۔

کڑھائی مٹن، کباب، چکن کی مختلف ڈشیں، فش فرائی سب کچھ تھا۔ فضا میں گوشت بھننے کی بڑی دلفریب خوشبو تھی۔ لیکن ماحول اور لوگوں کے رویے تکلیف دہ تھے۔ شلوار قمیض، بے ڈھنگی داڑھیاں، گول ٹوپیاں، بہت اکھڑ لوگ۔ ایک دوسرے سے فحش مذاق کرتے ہوئے۔ گھر، سڑک اور ہوٹل کے فرق کا شعور ہی نہیں۔ میں اس پورے ماحول کو کچھ دیر کھڑے ہو کر غور سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی ادھر سے دھکا دے کر گزر جاتا، کوئی اُدھر سے۔ پھر بھی بھوک پورے شباب پر تھی، اور کباب، قورمے کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا میں ایک بھٹیار خانے میں داخل ہو گیا۔ کرخت شکل وصورت کا ایک شخص بھٹیار خانے کے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے آگے چھوٹی سی کوئلوں کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ انگیٹھی پر ایک بڑا طباق رکھا ہوا تھا جس میں مصالحہ والی مچھلی کے قتلے پھیلے ہوئے تھے۔ قتلوں کو دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا...... چونکہ مسلم ہوٹلوں میں اکثر روٹیاں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ اس لئے میں نے بس یوں ہی اس شخص سے پوچھ لیا، جو کہ مجھے طبعاً اکھڑ معلوم ہوتا تھا۔

"روٹیاں تو گرم ہوں گی آپ کے یہاں۔ میرا مطلب ہے تندور تو جل رہا ہوگا؟"

میری بات سن کر اس شخص نے مجھے گھورا، سر پر سے ٹوپی اتاری اور سر کو زور سے کھجاتا ہوا کاؤنٹر کے پیچھے سے اٹھ کر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی دونوں موٹی موٹی آنکھیں، جو کہ جنگلی کبوتر کی آنکھوں کی طرح سرخ تھیں، میرے چہرے پر گڑاتے ہوئے بولا۔

''روٹی تو روٹی ہوتی ہے...... کیا گرم اور کیا ٹھنڈی۔ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ روٹی اللہ کی نعمت ہے۔ اسے کھا کر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ گرم اور ٹھنڈی کے چکر میں نہیں رہنا چاہئے...... سمجھے۔ تم مجھے کچھ پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تمہارے جیسے پڑھے لکھوں ہی نے مسلم مذہب کو غارت کیا ہے۔ روٹی چاہئے...... وہ بھی گرم...... یہاں جیسی بھی روٹی ہے، کھانی ہے تو کھاؤ ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

میں اس کی گھڑکی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ پیسے لے کر کھانا کھلاتے ہو یا خیرات بانٹ رہے ہو؟...... لیکن کہہ نا سکا۔ چپ چاپ کالو پور ٹاور سے ریلیف روڈ واپس آیا۔ ایک چھوٹے سے ریسٹورینٹ میں ڈلی سانبھر کو زہر مار کیا اور ہوٹل گرین پیلیس واپس آ گیا۔ کاؤنٹر پر اکبر بھائی کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''صبح ۴ بجے اٹھا دیں۔ مجھے یہاں سے جانا ہے۔ بل وغیرہ ابھی بھیج دیں اور اگر ممکن ہو تو صبح ۴ بجے ایک کپ چائے میرے کمرے میں بھجوا دیں۔''

اکبر نے میری شکل دیکھی اور مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''فکر مت کیجئے جناب۔ آپ کو صبح چار بجے چائے بھی ملے گی اور نوکر آپ کو اٹھا بھی دے گا۔''

مجھے اس کا رویہ اچھا لگا۔ میں نے اسے شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صبح ٹھیک چار بجے میرے کمرے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بیرا ٹرے میں چائے کی کیتلی اور کپ لئے کھڑا تھا۔ میں نے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے اور صبح کی چائے کا ذائقہ لینے لگا۔ مساجد سے فجر کی اذان شروع ہو چکی تھی

اور مندروں سے گھنٹے بجنے اور بھجنوں کی آوازیں آرہی تھیں، جو کہ رات کے خاتمے اور دن کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ فی الحال تو یہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں بے وجہ ہی رات گھبراتا رہا اور خوفناک خواب دیکھتا رہا۔ رات بھر سوتا جاگتا رہا۔ شہر میں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی چائے ختم کی، کمرے کا دروازہ بند کیا، ٹانگیں پھیلائیں اور لمبی تان کر سو گیا۔ دوبارہ جب آنکھ کھلی تو دن کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ میں جلدی سے اٹھا، باتھ روم گیا، نہایا، اپنا سامان سمیٹا، سوٹ کیس اٹھایا اور ہوٹل گرین پیلیس سے باہر آ گیا...... آٹو رکشا پکڑا اور بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ بس اسٹینڈ پر تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد سورت جانے کے لئے اتفاقاً ایک لگژری بس مل گئی۔ میں نے بس میں اپنا سامان رکھا، ٹکٹ خریدا اور ونڈو سائڈ کی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد بس چل پڑی اور جلدی ہی احمد آباد کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر نیشنل ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

کھیڑا ضلع شروع ہو چکا تھا۔ تمباکو اور کیلے کے کھیتوں کا دور دور تک پھیلا ہوا سلسلہ تھا جو کہ بے حد دلکش لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سرسرا رہے تھے اور کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چونکہ بس کی اسپیڈ خاصی تیز تھی، اس لئے سڑک کے دونوں طرف کے مناظر بھی تیزی سے بدل رہے تھے۔ ایسے میں مجھے ''کویتا لوج'' کے مالک دھن سکھ سیٹھ کی شدت سے یاد آرہی تھی۔

دھن سکھ سیٹھ ایک شریف اور شاندار انسان تھا۔ ہندوستانیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ کویتا لوج میں ٹھہرنے والے مسافروں کو مسافر نہیں، اپنا مہمان سمجھتا تھا اور مہمانوں کی طرح ہی ان کی خاطر اور دیکھ بھال کرتا تھا۔

کویتا لوج کے کچھ مستقل گراہک تھے یعنی وہاں پر بہت دنوں سے رہ رہے تھے۔ جن میں ظہیر خان، کرشنا، شنکر اور روی وغیرہ تھے۔ یہ سب دھن سکھ کے خاص مہمان بھی تھے اور دوست بھی۔ شام ہوتے ہی ظہیر خان کے کمرے میں شراب کی

بوتل، سوڈے، گلاس، ٹھنڈا پانی، سلاد اور اناس کے ٹکڑوں کے علاوہ مونگ پھلی کے موٹے موٹے دانے (جو کہ شرابیوں کے لئے خاص طور سے بھروچ سے منگوائے جاتے تھے) بڑے سلیقے سے سجا دیۓ جاتے۔ کرشنا کے کمرے میں چرس کی گولیاں، سگرٹ کے پیکٹ اور چرس کی گولیوں کو سلگانے کے لئے ماچس کی تیلیاں رکھ دی جاتیں۔ روی اور شنکر اول نمبر کے خانہ خراب تھے۔ دونوں افیم، بھانگ چرس اور شراب سب سے محظوظ ہوتے تھے لہٰذا ان کے کمرے میں بھی ضرورت کی تقریباً سب چیزیں پہنچا دی جاتیں۔ رات ہوتے ہی ان لوگوں کے کمروں میں دوست جمع ہو جاتے اور ہنگامہ شروع ہو جاتا۔ دھن سکھ سیٹھ فرداً فرداً سب کے کمروں میں جاتا اور معلوم کرتا۔ ''کیم صاحب! سب برو بر چھے نا؟''

''ارے دھن سکھ سیٹھ...... تم کمال کا مانس چھے۔ تارو جیسا بیجو کوئی مانس نہ تھی۔ اکھے گجرات ما تارو جواب نہ تھی۔''

ہر کمرے سے دھن سکھ سیٹھ کو ایسے ہی تعریفی کلمات سننے کو ملتے۔ اس کی باچھیں کھل جاتیں، وہ اپنی گول گول آنکھیں گھماتا، خوش ہوتا اور اپنے خاص ملازم عبدل سے کہتا۔

''صاحب نو خیال راکھ جو...... کیم؟''

گاندھی جی کی جنم بھومی ہونے کی وجہ سے گجرات ڈرائی ایریا ہے۔ یہاں شراب پینا قانوناً جرم ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اسی صوبے میں سب سے زیادہ انسانی خون پیا گیا اور بہایا گیا ہے۔ اگر دھن سکھ سیٹھ کے زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو گجرات سے شراب بندی ختم ہونی چاہئے کیوں کہ شراب پینا ایک سیکولر عمل ہے۔ بقول دھن سکھ سیٹھ کے، کہ سرکار اگر ہندو مسلم منافرت کو ختم کرنا چاہتی ہے تو گجرات کو Wet Area بنا دینا چاہئے۔ یہی وجہ تھی کہ اگر رات کے بارہ بجے بھی دھن سکھ کے کسی گراہک کو شراب کی یا چرس کی ضرورت پڑتی تو وہ چہک کر جواب دیتا۔

''کائی واندھا نہ تھی صاحب، کائی واندھا نہ تھی۔'' یہ کہہ کر وہ عبدل کو آواز

دیتا، اس کے کان میں کچھ کہتا، تھوڑی دیر میں عبدل شراب یا چرس لے کر مسافر کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ ظہیر خان تو خاص طور سے رات کے گیارہ یا بارہ بجے کے آس پاس اپنی لنگی لپیٹتا ہوا جو کبھی آدھی کھل جاتی، کبھی پوری، اپنے کمرے سے باہر آتا اور عبدل کو زور زور سے آوازیں دینے لگتا...... اور عبدل کو دیکھتے ہی شور مچاتا۔

''اے عبدل...... باٹلی کھلاس تھی گئی...... تما کھبر نہ تھی...... بیجی آپو......''

عبدل بڑے ادب سے جواب دیتا۔ ''سیٹھ آپ کمرے میں بیٹھو۔ میں لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ظہیر خان کا بازو پکڑ کر کمرے میں لے جاتا اور ظہیر خان کو اندر کر کے باہر سے دروازہ بند کر دیتا اور فٹافٹ دوسری بوتل لاتا...... ابھی وہ ظہیر خان کے کمرئے میں بوتل اور پانی رکھ ہی رہا ہوتا تھا کہ کرشنا کے کمرے سے زوردار آوازیں آنے لگتیں اور عبدل بجلی کی سی تیزی سے کرشنا کے کمرے میں ہوتا۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے کے آس پاس کویتا لوج کا ڈراپ سین کچھ اس طرح ہوتا کہ جب سب کمروں سے ہنگامے بند ہو جاتے اور آوازیں آنی بند ہو جاتیں، تب لوج کے اندر داخل ہونے والا لکڑی کا زینہ لرزنے لگتا اور دھڑ دھڑ کی آوازیں آنے لگتیں۔ پتہ چلتا کہ پولیس آفیسر ڈیسائی نشے میں دھت اپنے بھاری بھرکم ڈیل کو ڈھوتا ہوا اور بغل میں کسی بھکارن نما عورت کو دبائے ہوئے لوج میں داخل ہو رہا ہے۔ عبدل اور دھن سکھ سیٹھ دوڑے دوڑے زینے کی طرف جاتے اور ڈیسائی کو زینہ چڑھنے میں مدد کرنے لگتے۔ ایک منزل چڑھنے کے بعد جب ڈیسائی اور اس کی بغل میں دبی عورت کو دوسری منزل کے لئے (جو کہ آدھی سے زیادہ خالی تھی، صرف تین کمرے وہاں تھے، ایک میں ڈیسائی رات بسر کیا کرتا تھا اور دو کویتا لوج کے اسٹور تھے۔) لے جایا جاتا تو وہ عورت زور زور سے رونا شروع کر دیتی۔ اس پر ڈیسائی گینڈے کی طرح پلٹتا اور عورت کو مارنے کے لئے ہاتھ گھماتا۔ لیکن وہ عورت نیچے کو جھک جاتی اور ڈیسائی کا وار خالی چلا جاتا۔ جب تک ڈیسائی کچھ سنبھل کر دوسرا وار کرنے کی پوزیشن میں آتا، تب تک عبدل اور دھن سکھ اس

عورت اور ڈیسائی کو کمرے میں دھکیل دیتے اور زینے کا دروازہ باہر سے بند کر دیتے۔ کچھ دیر تک ڈیسائی کے کمرے سے عورت کے چیخنے چلاّنے کی آوازیں آتیں، پھر اس کے بعد فضا ہموار ہو جاتی اور کویتا لوج میں سناٹا چھا جاتا۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور میری سوچوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ بس بڑودہ اور بھروچ کے درمیان ہائی وے پر بنے ڈھابے پر رکی تھی...... بس کے کنڈکٹر نے زور زور سے کہا...... "بس چائے ناشتے کے لئے پندرہ منٹ رکے گی۔"

میں جب سورت پہنچا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ آسمان پر شفق باقی تھی جو کہ آہستہ آہستہ سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا سوٹ کیس اُٹھایا اور پیدل ہی کویتا لوج کی طرف چل دیا۔ یوں بھی Lodge بس اسٹینڈ اور ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہ تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ برسوں کے بعد دھن سکھ سیٹھ سے ملنے کا تجسس بھی تھا اور تفکر بھی کہ اچانک مجھے سامنے دیکھ کر دھن سکھ کیا سوچے گا؟ کیا وہ مجھے پہچان پائے گا؟ اگر پہچان لیا تو اس کے تاثرات کیا ہوں گے اور اگر اتفاقاً اس نے نہیں پہچانا تو میری حالت کیا ہوگی......؟ انہیں خیالات میں غوطہ زن میں چلتا رہا اور کویتا لوج تک پہنچ گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ بجلی کے بلب روشن ہو چکے تھے لیکن کویتا لوج میں روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں لئے Lodge میں داخل ہو گیا...... لکڑی کا وہی پُرانا زینہ تھا۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی میں چونک گیا...... سیڑھی کے اوپر سیاہی مائل ایک بڑا سا دھبہ تھا۔ دھبے کے کنارے گہرے عنابی تھے۔ یہ سلسلہ پورے زینے پر تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے عنابی سیال زینے پر گر گیا ہو اور وقت کے دھارے نے اسے کالے دھبوں میں تبدیل کر دیا ہو۔ پہلی منزل پر پہنچ کر میں مزید حیران ہوا کہ لوج کے اندر روشنی غائب تھی، فقط ایک زیرو واٹ کا بلب جل رہا تھا...... Reception کی جگہ ایک شخص اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اس کی بے ترتیب داڑھی اور مونچھیں تھیں، سر کے بال بھی لمبے تھے اور اس کے ماتھے پر لمبا تلک لگا

تھا...... پہلی نظر میں وہ سادھو جیسا لگتا تھا۔ لیکن اس کا لباس سادھوؤں جیسا نہ تھا...... اس نے چونکتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا...... میں نے اپنا سوٹ کیس زمین پر رکھتے ہوئے اس سے کہا۔ ''مجھے رات گزارنے کے لئے ایک کمرہ چاہئے۔''

اس شخص نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کچھ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہاں اب مسافر نہیں ٹھہرتے۔'' مجھے اس کی آواز جانی پہچانی سی لگی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو اس کا چہرہ بھی جانا پہچانا سا لگا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یہ لوج ہے...... پھر یہاں مسافر کیوں نہیں ٹھہر سکتے عبدل؟'' میرے عبدل کہہ کر مخاطب کرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر کسی طرح کے تاثرات پیدا نہ ہوئے۔ اس نے اسی ٹھہرے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''یہ جگہ مسافروں کے لئے بند کر دی گئی ہے۔ یہاں اب کار سیوک آ کر ٹھہرتے ہیں اور اپنی میٹنگیں کرتے ہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' یہ تخریب کار بھی کیسے کیسے نام رکھتے ہیں۔ کہیں کار سیوک، کہیں مجاہدین...... عبدل، تم مجھے پہچان نہیں رہے ہو، میں مراد آباد کے برتن بیچنے والا ہوں۔ اس لوج کے کمرہ نمبر سات میں، میں کئی سال رہا ہوں۔ تم یاد کرو، جس دن میرا کام اچھا ہوتا تھا اور معقول رقم میری جیب میں آجاتی تھی، اس دن میں بلقیس کو بلایا کرتا تھا۔ تم ہم دونوں کو چکن بریانی کھلایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم دونوں کے ساتھ فلم دیکھنے بھی جایا کرتے تھے...... اچھا عبدل، یہ بتاؤ دھن سکھ سیٹھ کہاں ہیں؟''

''اُن کو قتل کر دیا گیا۔'' عبدل کی آواز گونجی...... میں نے حیرت سے کہا۔

''کیا؟ دھن سکھ سیٹھ جیسے پُرخلوص اور نفیس انسان کو کس نے قتل کیا؟''

''معلوم نہیں صاحب۔ جب گودھرا اور احمد آباد میں فساد ہوئے تب یہاں بھی تناؤ بڑھ گیا۔ سیٹھ ہندو مسلم نفرت پھیلانے والوں کو کھلم کھلا گالیاں بکتا تھا۔ تناؤ جب زیادہ بڑھا اور جھگی جھونپڑی والے مسلمانوں کو اجاڑا گیا تو اپنا سیٹھ مسلمانوں کی حمایت

میں کھل کر سامنے آ گیا۔ بس پھر کیا تھا، پہلے تو اسے دھمکیاں دی گئیں، پھر ایک دن شام کو کچھ لوگ آئے اور جہاں آپ کھڑے ہیں، اسی جگہ پر دھن سکھ سیٹھ کو پکڑا اور قتل کر دیا...... اس کے بعد وہ لوگ ان کی لاش گھسیٹتے ہوئے زینے سے نیچے سڑک پر لے گئے اور سڑک کے بیچوں بیچ رکھ کر شور مچایا کہ دیکھو، مسلمانوں نے دھن سکھ سیٹھ جیسے سجن مانس کی ہتیا کر دی...... پھر کیا تھا صاحب...... دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر بھاری بوٹوں کی زد میں آ گیا۔ کچھ علاقوں میں تو بھیانک کالی آندھی چلی اور انسانی خون پانی کی طرح نالیوں اور سڑکوں پر بہا دیا گیا۔"

"اوہ...... عبدل، میں بہت دور سے دھن سکھ سیٹھ سے ملنے آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں قیامت گزر گئی۔ میں یہاں بہت دنوں تک سات نمبر کے کمرے میں رہا ہوں۔ اس کے سامنے والے میں ظہیر خان رہا کرتے تھے اور ان کے برابر والے میں کرشنا وغیرہ رہتے تھے۔ ذرا کمرے تو کھول کر دکھاؤ۔"

یہ سنتے ہی وہ اپنی جگہ سے اُٹھا، کمروں کی چابیاں اٹھائیں اور Lodge کی گیلری میں داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے کرشنا والا کمرہ کھولا...... اس کمرے میں ترشول، تلواریں، لاٹھیاں اور اسی قسم کے ہتھیار تھے۔ میں نے پوچھا...... "یہ کیا ہے؟" اس نے جواب دیا...... "یہ کارسیوکوں کے کارسیوا کرنے کے اوزار ہیں۔"

اس کے بعد اس نے ظہیر خان والا کمرہ کھولا...... اس کے اندر مسلم عورتوں کے برقعے، شلواریں اور قمیصیں ٹنگی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا...... "یہ کیا ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "یہ کارسیوکوں کی ویرگاتھا اور شوریہ گاتھا کی نشانیاں ہیں۔" اس کے بعد اس نے میرا والا کمرہ کھولا۔ وہ کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں کچھ پتلی، اور کچھ موٹی موٹی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ ان کتابوں پر ہیڈگیوار، گرو گولوالکر، شیاما پرساد مکھرجی، دیورس، وی۔ ڈی۔ ساورکر، ایڈوانی اور نریندر مودی وغیرہ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں...... میں نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے جواب

دیا۔ ''یہ کارسیوکوں کا ساہتیہ ہے۔ نوجوانوں کو یہ ساہتیہ پڑھنے کے لئے دیا جاتا ہے اور کارسیوکوں میں شامل ہونے کی صلاح دی جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کمرے بند کرنے شروع کر دیئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''اوپر والے مالے کا کیا حال ہے، جہاں ڈیسائی نشے میں دھت ہو کر عورتوں کو لایا کرتا تھا اور وہ عورتیں رات کو چیخا کرتی تھیں اور شور مچایا کرتی تھیں؟''

اس پر اس نے جواب دیا۔

''اوپر والا مالا مکمل طور پر بند کر دیا گیا ہے۔ وہاں سے اب بھی رات کو رونے اور چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔''

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اسی جگہ واپس آ گئے، جہاں عبدل اسٹول ڈال کر بیٹھا تھا۔ چلتے ہوئے اس نے کسی کمرے میں سے میرے لئے بھی ایک اسٹول اٹھا لیا۔ لہٰذا ہم دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔

میں نے اس سے معلوم کیا۔

''یہ عمارت، جس کے نیچے دکانیں اور اوپر کویتا لوج واقع ہے، کیا دھن سکھ سیٹھ کی ملکیت نہ تھی کہ اب یہاں کارسیوک آ دھمکے ہیں؟''

''یہ کسی سنستھا کی جگہ ہے......'' عبدل نے کہا۔ ''دھن سکھ سیٹھ تو کرائے دار تھے۔ اب اس سنستھا نے یہ اوپر کے دو مالے، جن میں کہ کویتا لوج تھا، کارسیوکوں کو دان کر دیئے ہیں۔''

میں نے اس سے پوچھا۔

'اچھا، عبدل یہ بتاؤ، تم نے اس طرح کا حلیہ کیوں اختیار کیا ہے؟ یہ سادھوؤں جیسی داڑھی مونچھیں، ماتھے پر تلک......''

اس نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے پاس سگریٹ تو ہوگا! ایک سگریٹ پلایئے۔''

میں نے سگریٹ کا پیکٹ اپنی جیب سے نکالا۔ ایک سگریٹ عبدل کو دیا اور

ایک اپنے منہ میں لگا لیا۔ عبدل نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا اور سارا دھواں خلاء میں چھوڑ دیا۔ میں چند لمحوں تک اپنے سوال کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن عبدل تو جامد و ساکت تھا۔ میں نے بھی سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اس سے بولا۔

''عبدل، یہ بتاؤ بلقیس کہاں ہے؟ اس سے ملنے کو میرا دل بیقرار ہے!''

یہ سنتے ہی عبدل کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا سگریٹ چھوٹ گیا اور اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ میں نے دھندلکے میں بھی محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں جو کہ اس کی گھنی داڑھی میں جذب ہو رہے ہیں۔ خوف کی پرچھائیاں اس کے وجود میں لرزاں تھیں۔ چند لمحوں کے بعد اس کے ہونٹ کانپے اور مغموم سی بھرّائی ہوئی آواز میں وہ گویا ہوا۔

''اب آپ جاؤ صاحب...... اندھیرا ہو گیا ہے اور کارسیوکوں کے آنے کا سمے ہو گیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اسٹول پر سے اُٹھا، زمین پر سلگتے ہوئے سگریٹ کو اس نے اپنے پیروں سے مسلا، اپنے دونوں ہاتھوں کو پیٹھ کے پیچھے باندھا، اور Lodge کی گیلری میں داخل ہوا اور چلتا چلا گیا۔

OO

تخلیق کار پبلیشرز کی مطبوعات ایک نظر میں

	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	پھول جیسے لوگ (ناول)	انور خان	80.00
۲۔	یادبسیرے (افسانے)	انور خان	80.00
۳۔	لمحوں کی قید (افسانے)	کشور سلطانہ	80.00
۴۔	افسانہ ۸۹ء (انتخاب)	مرتب: انیس امروہوی	80.00
۵۔	برزخ (افسانے)	ہاجرہ شکور	80.00
۶۔	فرات (ناول)	حسین الحق	100.00
۷۔	نیلام گھر (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
۸۔	گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے)	علی امام نقوی	60.00
۹۔	بھوکا ایتھوپیا (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	110.00
۱۰۔	کانچ کی چادر (شاعری)	مریم غزالہ	60.00
۱۱۔	رنگین پرواز (اردو/ہندی شاعری)	پی۔این۔رنگین	80.00
۱۲۔	اردو تنقید حالؔی سے کلیم تک (تحقیق)	سید محمد نواب کریم	125.00
۱۳۔	دل کی بات (افسانے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	60.00
۱۴۔	کاغذ کی دیوار (افسانے)	محافظ حیدر	60.00
۱۵۔	ادھار کی زندگی (افسانے)	مہر چند کوشک	60.00
۱۶۔	اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ (تنقید)	ڈاکٹر محبوب اعلیٰ قریشی	125.00
۱۷۔	رت جگے (شاعری)	رحمت امروہوی	60.00
۱۸۔	پیاسا سمندر (افسانے)	عقیلہ تبسم	60.00
۱۹۔	ڈار سے بچھڑے (افسانے)	سید محمد اشرف	100.00
۲۰۔	غالبیات اور ہم (تحقیق)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	50.00
۲۱۔	آخری داستان گو (ناول)	مظہر الزماں خاں	80.00
۲۲۔	رشید احمد صدیقی کے اُسلوب کا تجزیاتی مطالعہ (تنقید)	خواجہ محمد اکرام الدین	80.00

۲۳۔	دخترِ ابلیس (افسانے)	محمد شبیر علی محمدوی	60.00
۲۴۔	حکیم کلبِ علی شاہد: شخصیت اور فن (مقالے)	خورشید مصطفٰی رضوی	60.00
۲۵۔	ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے (سفرنامہ)	پروفیسر علیم اللہ حالی	50.00
۲۶۔	ساغر نظامی: حیات اور ادبی خدمات (تحقیق)	ڈاکٹر سلمٰی شاہین	100.00
۲۷۔	مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار (تحقیق)	ڈاکٹر توحید خاں	80.00
۲۸۔	لیکن جزیرہ نہیں (افسانے)	تبسم فاطمہ	60.00
۲۹۔	اپٹا اور اردو ڈراما (تحقیق)	شاہد رزمی	60.00
۳۰۔	روتا ہوا آدمی (افسانے)	رئیس نجمی امروہوی	80.00
۳۱۔	فلسطین کے چار ممتاز شعراء (تنقید)	عبدالحق حقانی القاسمی	60.00
۳۲۔	کنیادان (ڈرامے)	وجے تنڈلکر (اردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق)	80.00
۳۳۔	شہر چپ ہے (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
۳۴۔	بیان (ناول)	مشرف عالم ذوقی	100.00
۳۵۔	منڈیر پر بیٹھا پرندہ (افسانے)	احمد صغیر	60.00
۳۶۔	سخنورانِ شاہجہان پور (تذکرہ)	مبارک شمیم	125.00
۳۷۔	راہ میں اجل ہے (افسانے)	زاہدہ حنا	100.00
۳۸۔	مطالعہ مثنویات مصحفی (تنقید)	ڈاکٹر سعیدہ وارثی	100.00
۳۹۔	بے زبانی کا ہنر (شاعری)	ڈاکٹر سجاد سید	60.00
۴۰۔	حجاب امتیاز علی: حیات اور ادبی کارنامے (تنقید)	مجیب احمد خاں	80.00
۴۱۔	اسرارِ غالب (تنقید)	سید قدرت نقوی	60.00
۴۲۔	اردو فکشن کی تنقید (تنقید)	ڈاکٹر ارتضٰی کریم	250.00
۴۳۔	سنگ اُٹھانے کا حوصلہ (افسانے)	رضاء الجبار	80.00
۴۴۔	مظہر امام کی تنقید نگاری (تنقید)	محمد رضا کاظمی	60.00
۴۵۔	شاخیں (مضامین)	ڈاکٹر علیم اللہ حالی	60.00
۴۶۔	پوسٹر (افسانے)	قاسم خورشید	60.00

۴۷۔ جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	90.00
۴۸۔ ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفرنامہ)	ڈاکٹر قمر رئیس	100.00
۴۹۔ کن فیکون (افسانے)	رضوان احمد	90.00
۵۰۔ ادب میں گھوسٹ اِزم (طنز ومزاح)	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	80.00
۵۱۔ سلسلے (شاعری)	مدہوش بلگرامی	60.00
۵۲۔ اجنبی ساعتوں کے درمیان (شاعری)	نعمان شوق	60.00
۵۳۔ ایک جام اور (شاعری)	فرحت قادری	60.00
۵۴۔ سوادِ جاں (شاعری)	مبارک شمیم	60.00
۵۵۔ رابطہ (مضامین)	جوگندر پال	90.00
۵۶۔ جمیل مظہری: بحیثیت نثر نگار (تنقید)	ڈاکٹر نعمت اللہ	80.00
۵۷۔ جدید ہندی شاعری (تنقید)	خورشید اکرم	80.00
۵۸۔ منڈی (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	100.00
۵۹۔ تکمیل (شاعری)	من موہن تلخ	80.00
۶۰۔ سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ (افسانے)	حسین الحق	80.00
۶۱۔ قمر رئیس: ایک زندگی (شخصیت)	مرتب: ڈاکٹر سلمیٰ شاہین	250.00
۶۲۔ بے اصطلاح (مضامین)	جوگندر پال	90.00
۶۳۔ ٹھہرے ہوئے لوگ (افسانے)	انجم عثمانی	80.00
۶۴۔ اردو افسانے کا پس منظر (تنقید)	فیاض رفعت	60.00
۶۵۔ دستک (شاعری)	اختر شاہجہاں پوری	80.00
۶۶۔ بے ارادہ (افسانے)	رفیع حیدر انجم	80.00
۶۷۔ ادب کی تفہیم (تنقید)	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی	80.00
۶۸۔ آئینے کی گرد (افسانے)	شکیل جاوید	80.00
۶۹۔ ہندوستان میں جنگ جمہوریت (سوانح)	جگت رام ساہنی	90.00
۷۰۔ سب رس: جدید اردو میں (تنقید)	قاضی انیس الحق	150.00

۷۱۔ وینس کا پھول (افسانے)	سہیل اعجاز صدیقی	90.00
۷۲۔ موسم عذابوں کا (افسانے)	علی امام نقوی	80.00
۷۳۔ غلام بخش اور دیگر کہانیاں (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	120.00
۷۴۔ وہ دن (افسانے)	غیاث الرحمٰن	80.00
۷۵۔ مراثیٔ شاد کا فکری پہلو (تنقید)	پروفیسر اظہار احمد	100.00
۷۶۔ شام اودھ (ڈرامے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	100.00
۷۷۔ اردو کے نثری اسالیب (تنقید)	شہاب ظفر اعظمی	150.00
۷۸۔ کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ (تنقید)	ڈاکٹر ابرار رحمانی	150.00
۷۹۔ جھلتے جنگل (ناول)	انور عظیم	100.00
۸۰۔ اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات (تنقید)	ڈاکٹر شہناز شاہین	120.00
۸۱۔ میری کہانی (سوانح)	اویس احمد دوراں	120.00
۸۲۔ دس دن (ناول)	دُرواسا	90.00
۸۳۔ پرندے (افسانچے)	جوگندر پال	90.00
۸۴۔ ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے)	مجتبیٰ حسین	80.00
۸۵۔ مثنوی مناقب خواجہ (شاعری)	محمد علی موجؔ رام پوری	50.00
۸۶۔ معاصر اسلامی تحریکات اور فکرِ اقبالؔ (تنقید)	ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	150.00
۸۷۔ آخر کب تک (ناول)	اقبالؔ نظامی	120.00
۸۸۔ ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید (تنقید)	احمد سہیل	200.00
۸۹۔ ذبح (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
۹۰۔ زندہ اپنی باتوں میں: بیدی، عصمت اور عباس (انٹرویوز)	فیاض رفعت	90.00
۹۱۔ مضامین نو (مضامین)	نرگس سلطانہ	100.00
۹۲۔ اردو میں قصیدہ نگاری (تنقید)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	150.00
۹۳۔ لابوہیم (افسانے)	انور عظیم	120.00
۹۴۔ بساط (ناول)	علی امام نقوی	100.00

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۹۵۔	مٹی کے حرم (ناول)	ساجدہ زیدی	250.00
۹۶۔	کلیاتِ کیف (شاعری)	کیف گنگوہی	150.00
۹۷۔	مکالمہ (آجکل کے اداریے)	محبوب الرحمٰن فاروقی	200.00
۹۸۔	اردو شاعری کے روشن چراغ (تذکرہ)	طارق متین باغپتی	100.00
۹۹۔	آدھی رات کی شبنم (شاعری)	مرغوب علی	100.00
۱۰۰۔	مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک (تحقیق)	ڈاکٹر محمد کاظم	100.00
۱۰۱۔	صوبہ سرحد میں جنگِ آزادی (سوانح)	جگت رام ساہنی	100.00
۱۰۲۔	اصطلاحاتِ نفسیات: تشریح و تفہیم	سیّد اقبال امروہوی	200.00
۱۰۳۔	کارواں گزر گیا (افسانے)	ایم۔ ایچ۔ خان	150.00
۱۰۴۔	حاضر حال جاری (افسانے)	سریندر پرکاش	250.00
۱۰۵۔	واپسی سے پہلے (افسانے)	صغیر رحمانی	150.00
۱۰۶۔	نادید (ناول)	جوگندر پال	150.00
۱۰۷۔	ہرچرن چاولہ: فن اور شخصیت (مضامین)	مرتب: ڈاکٹر نگار عظیم	150.00
۱۰۸۔	ادراکِ فن (تذکرہ)	اختر شاہ جہانپوری	150.00
۱۰۹۔	گمشدہ آدمی (افسانے)	یٰسین احمد	150.00
۱۱۰۔	جدید نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سیّد اقبال امروہوی	150.00
۱۱۱۔	غمِ دل وحشتِ دل (ناول)	ڈاکٹر محمد حسن	250.00
۱۱۲۔	بلونت سنگھ: فن اور شخصیت (تحقیق)	ڈاکٹر ممتاز آراء	200.00
۱۱۳۔	بھگت سنگھ کی واپسی (ڈرامے)	ساگر سرحدی	150.00
۱۱۴۔	مسیحا کی موت (افسانے)	قاضی انیس الحق	200.00
۱۱۵۔	شہرِ نگاراں (ناول)	رفعت سروش	200.00
۱۱۶۔	مولانا شبلی: ایک مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر نیر جہاں	250.00
۱۱۷۔	فساد (ناول)	مہر الدین خاں	100.00
۱۱۸۔	رسالہ "جامعہ" کا تنقیدی اشاریہ	ڈاکٹر فرزانہ خلیل	300.00

۱۱۹۔ فرات: مطالعہ، محاسبہ (تجزیہ) مرتب: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی 120.00

۱۲۰۔ گلدستۂ بیت بازی (شعری انتخاب) مرتب: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی 200.00

۱۲۱۔ مضامین ہفت رنگ (تنقیدی مضامین) محبوب الرحمٰن فاروقی 200.00

۱۲۲۔ تنقیحات (تنقیدی مضامین) ڈاکٹر نیّر جہاں 150.00

۱۲۳۔ لندن کے رات دن (افسانے) علی باقر 350.00

۱۲۴۔ جوشؔ ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس 200.00

۱۲۵۔ انتخاب ن۔م۔راشد (شاعری) مرتب: مرغوب علی 180.00

۱۲۶۔ درد کا رشتہ (افسانے وناولٹ) راشد سہسوانی (مرتب: خرم جاوید) 200.00

۱۲۷۔ نثری بیانیہ (تنقید) ڈاکٹر مجید بیدار 150.00

۱۲۸۔ تپش (افسانے) ولی محمد چودھری 150.00

۱۲۹۔ روزمرہ کی نفسیات (مختلف نفسیاتی مضامین) سید اقبال امروہوی 200.00

ہماری آئندہ اشاعتیں

۱۔ روداد انجمن (یادیں) حمید اختر زیر طبع

۲۔ پردے کے پیچھے (فلمی مضامین) انیس امروہوی زیر طبع

۳۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا (فلمی شخصیات) انیس امروہوی زیر طبع

۴۔ یہ خلدِ بریں ارمانوں کی (مضامین) مرتب: ڈاکٹر شکیل اختر زیر طبع

۵۔ درد کا پورٹریٹ (ڈرامے) مظہر الزماں خاں زیر طبع

۶۔ سلسلہ (مضامین) ہرچرن چاؤلہ زیر طبع

۷۔ نجات دہندہ کی تلاش (افسانے) وجے زیر طبع

۸۔ سفر کہانی (پاکستان کا سفرنامہ) مرغوب علی زیر طبع

۹۔ روشنائی (روداد انجمن ترقی پسند مصنفین) سجاد ظہیر زیر طبع

۱۰۔ مٹھی بھر سانپ (افسانے) سلیم اختر زیر طبع

۱۱۔ عورت زندگی کا زنداں (مضامین) زاہدہ حنا زیر طبع

۱۲۔ معین احسن جذبیؔ: ایک مطالعہ مرتب: انیس امروہوی زیر طبع

۱۳۔ دوزاویے (انتخابِ نظم)	مرتب: انیس امروہوی	زیرِطبع
۱۴۔ پل دو پل (افسانے)	انور عظیم	زیرِطبع
۱۵۔ صدی کا افسانہ (انتخاب)	مرتب: انیس امروہوی	زیرِطبع
۱۶۔ خواتین کے افسانے (انتخاب)	مرتب: انیس امروہوی	زیرِطبع
۱۷۔ گلستانِ بیت بازی (شعری انتخاب)	مرتب: ڈاکٹر نیّر جہاں	زیرِطبع

رابطہ :
تخلیق کار پبلشرز، 104/B، یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

عِلم اور عَمل

یاد رکھو کہ
عِلم کے ساتھ عَمل ضروری ہے
نہ عَمل کے بغیر عِلم نافع ہے اور نہ عِلم کے بغیر
عَمل نفع بخش ہے
جس عِلم کی پُشت پر عَمل موجود نہ ہو
وہ عِلم جہل ہی کے زمرے میں شامل ہے۔

○○

— حضرت داتا گنج بخشؒ

﴿کَشفُ المَحجُوبؒ سے﴾

۱۲ رمئی ۱۹۵۱ء کو اتر پردیش کے مردم خیز ضلع مرادآباد کے چھوٹے سے گاؤں چھروہ خان پور میں جناب احمدالدین صاحب کے یہاں ولی محمد چودھری کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم قریب کے ہی تھوڑے بڑے گاؤں مونڈھا پانڈے میں حاصل کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم مرادآباد کے ہیوٹ مسلم انٹر کالج سے حاصل کی اور ہندو ڈگری کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد مرادآباد کے برتنوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس کاروبار میں ولی محمد چودھری نے زیادہ پیسہ تو نہیں کمایا، مگر ہندوستان کے بیشتر شہروں کا سفر کرنے اور زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع انہیں ملا۔ ۱۹۸۲ء میں ولی محمد چودھری کی شادی امروہہ کی ایک گھریلو قسم کی لڑکی سے ہوگئی اور انہوں نے مستقل طور پر امروہہ اپنا وطنِ ثانی بنالیا، اور یہیں پر ائرگن کے چھرّے بنانے اور اسی سے متعلق دوسرا سامان تیار کرنے کا ایک کارخانہ 'ٹارگیٹ انڈسٹریز' کے نام سے قائم کرلیا۔ امروہہ کی ادبی فضا میں ولی محمد چودھری نے دو عشق کئے۔ ایک کے نتیجے میں آج وہ تین بچوں، ایک لڑکا اور دو لڑکیوں کے باپ ہیں اور دوسرے اردو زبان سے عشق کے نتیجے میں ایک کامیاب افسانہ نگار!

اردو زبان سے دل کی گہرائی تک دلچسپی نے امروہہ میں ہی ولی محمد چودھری کو مطالعہ کا چسکا لگا دیا تھا۔ ابن صفی، مشتاق احمد یوسفی اور الیاس سیتاپوری کی تحریروں کے لگاتار مطالعے اور ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کے مشاہدے نے ولی محمد چودھری میں زندگی سے متعلق گہری بصیرت پیدا کر دی اور وہ افسانے کے تخلیقی سفر پر چل پڑے۔ اس کے ساتھ ہی منٹو، بیدی، کرشن چندر اور کئی غیر ملکی افسانہ نگاروں کے مطالعہ سے ان کی تحریروں میں پختگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ زیرِ نظر کتاب **تپش** ولی محمد چودھری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل کئی افسانے ان کے ابتدائی دور کے ہیں جن کے مطالعہ سے ان کے ادبی سفر کے بتدریج ارتقاء کی نشاندہی ہوتی ہے۔

—— انیس امروہوی

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092
Ph : 011-55295989, 22442572 E-mail : qissey@rediffmail.com